جلد (۹) عدد (۳)
رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۵ھ

رجسٹرڈ نمبر ۳ صفحہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ (۸؍)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ دیگر مذاہب میں جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت اور یہودیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ

جنگ اور تہذیب جدید بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

مقطع ... صفحات قیمت مجلد (صہ، انگریزی (۵ہ) سکہ عثمانیہ غیر مجلد (للعہ، انگریزی (۴ہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن۔ (حیدرآباد دکن)

فہرست مضامین

ماہ رمضان ۱۳۵۵ھ جلد ۹ عدد (۳)

ضرورت :۔ دفتر ترجمان القرآن کو رسالہ ہذا کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے :۔ محرم ۱۳۵۲ھ ۔ شعبان ۱۳۵۲ھ ۔ رمضان ۱۳۵۲ھ ۔ محرم و صفر ۱۳۵۴ھ ۔ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ ۔ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ ۔

جو حضرات ان پرچوں کو فروخت کرنا چاہیں وہ دفتر سے مراسلت فرمائیں۔

منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"سورۂ احزاب میں حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر)۔ مگر حضرت زید نے اس حکم نبوی کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینب کو طلاق دے دی۔ اس فعل کے خلاف حکم ہونے میں تو کوئی شبہہ نہیں اور قرآن کے انداز بیان میں صراحتًا یا کنایتًہ ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زید کی اس سرتابی کو کسی ادنیٰ درجہ میں بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیان واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (جس پر اللہ نے انعام کیا) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جاسکتی ہے، اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہوجائے کہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی وہ اس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے"

سوال ہی کوئی پیچیدگی نہیں، چند لفظوں میں شبہہ کو رفع کیا جاسکتا تھا لیکن دراصل یہ شبہہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہاں متعدد غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دور تک پہنچا ہوا ہے، اسلئے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اصل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیے جائیں۔

قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ صرف اسی کو یہ حق ہے کہ جیسا چاہے حکم دے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ اطاعت دراصل اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلقت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور صرف اسی کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ اس کے سوا انسان نہ کسی کا مخلوق ہے، نہ مربوب ہے، نہ بندہ ہے۔ اس لیے فی الاصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر حاکمیت مطلقہ حاصل ہے، اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ وہ اس خاص شخص کا حکم ہے۔

قرآن کے نزول کا اصلی مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور مُطاعِ حقیقی کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے۔ اور اس کے امر و نہی کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لئے بمنزلۂ خدا ہے اور اس قسم کی اطاعت

محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے، اور جو لوگ اپنے احبار و رہبان اور مذہبی پیشواؤں اور دنیوی حاکموں کو ارباب من دون اللہ بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھیراتا ہے، کیونکہ انسان جب کبھی کسی انسان کی ایسی اطاعت کرےگا، تو لا محالہ اس کی تہ میں الوہیت کا تصور اور عبودیت کا جذبہ ہی کار فرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلیۃً دست بردار ہوتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خطا سے بری اور عیوب و نقائص سے منزہ اور جزو کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ بالذات امر و نہی کا مالک ہے اور اسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے، اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے؟ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص مثلاً ابن عمران، یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے، اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو امر و نہی اور تحلیل و تحریم کا ذاتی حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ نبی خود بھی ارباب من دون اللہ میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں اس کا مقصد بعثت فوت ہو کر رہے گا۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا - وَقَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ۔ البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اور تم میں عظیم الشان فرق ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ حکم بھی عطا ہوتا ہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ حکم کے مفہوم میں قوت فیصلہ اور اقتدار حکومت (اتھارٹی) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو اقتدار حاصل ہے وہ خدا کا دیا ہوا اقتدار ہے، اس لیے اس کی اطاعت دراصل خدا ہی کی اطاعت ہے۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ وہ بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے تم پر حکومت کرے اور تم اس کی اطاعت کرو

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون وچرا کرنے کا حق نہیں۔ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی و یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا۔ عمل تو درکنار اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آجائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما اور اس نافرمانی کا نتیجہ ابدی خسران ونامرادی ہے یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا یہ طاعت اور کامل سپردگی جس پر دین وایمان کا مدار رکھا گیا ہے اور جس کے متعلق صاف کہدیا گیا ہے کہ "ہدایت بالکلیہ نبی کی اطاعت پر منحصر ہے" (وان تطیعوہ تھتدوا)، اس کا مرجع نبی کی شخصی بشری حیثیت نہیں ہے کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنالے، بلکہ اس لیے بھیجا کہ وہ ان کو خدا کا تابع فرمان بنائے۔ ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین۔ وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی پر مجبور کرے، اور اپنی شخصی عظمت وبزرگی کا سکہ ان پر جمائے اور ان کو اپنے شخصی اقتدار کے شکنجہ میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلہ میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دست بردار ہو جائیں، اور اپنے دل اور دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہے جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا جاتا ہے۔ انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی تو نبی کی بعثت کا مقصود ہے

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ انسان نے حلال و حرام کی من مانی حدیں مقرر کرنے کے جن اختیارات پر قبضہ کر لیا تھا ان کو سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ۔ انسانی حکم اور انسانی فیصلہ کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوت قائم کی جاتی ہے۔ وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی ان کی گردن سے دوسروں کا طوق اتار کر اپنا طوق ڈال دے اور تحلیل و تحریم کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں کر لے اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جائے۔ اس نے تو یہود و نصاریٰ کو اسی پر ملامت کی تھی کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ پھر وہ کیسے کہتا کہ اب تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو رب بنا لو اور میری خواہشات نفس کی پابندی کرو؟

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کراتا ہے کہ اطاعت مفروضہ جو اصل ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سرتابی کیا معنی یک سر مو انحراف کا بھی حق نہیں، وہ دراصل ذات نبویہ کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اُس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس فیصلہ کی اطاعت ہے جسے اللہ کا نبی خود اللہ سے حاصل کر کے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے اور اس اعتبار سے اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء:۱۶) اے نبی ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس حق و صواب کے مطابق

فیصلہ کرو جو اللہ تم کو سمجھا دے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ - (المائدہ: ۷)

اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (الانعام: ۵)

میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی ہے؛ اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبی کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو "حکم" عطا کیا گیا ہے۔ حکام کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسول کے امر و نہی اور ان کے مقرر کیے ہوئے حدود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے، وہ اس میں ہرگز کوئی چون و چرا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کو خدا کے مقابلہ میں کوئی حریت فکر اور آزادی رائے حاصل نہیں لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے، تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور ائمہ اور حکام تو درکنار، خود رسول خدا کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ انسان کی گردن میں ڈالدیں۔ اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اس کی گردن سے اتار پھینکیں یہ دونوں کام آپ کے مقصد بعثت میں شامل تھے اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں کیونکہ آپکی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت موقوف تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپ خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین فرمادیں کہ کسی انسان کی حتّٰی کہ خود آپ کی حیثیتِ انسانیہ کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے، اور ان کی روحیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیتِ نبوت اور حیثیت بشریت دونوں جمع تھیں اور ان کو کسی واضح خط امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر اللہ کے رسول پاک نے اللہ کی بخشی ہوئی حکمت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا۔ آپ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخ عالم میں کبھی کسی امیر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے جان نثار متبعین کو ایسی آزادی رائے عطا کی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ بلکہ سچ یوں ہے کہ آپ نے جس طرح اپنے پیرودں میں حریت فکر کی روح پھونکی، اور جس طرح صحیح جمہوری اصول پر ان کی تربیت فرمائی اور جس طرح خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں اُن کی ہمت افزائی کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل اپنی حیثیتِ انسانی میں بھی آپ جو کچھ کرتے تھے وہ بعینہٖ آپ کی حیثیتِ نبوی کے ماتحت ہوتا تھا۔ یا بالفاظ دیگر یہ بھی آپکے فرائض نبوت کا ایک شعبہ تھا کہ آپ کچھ امور حیثیت انسانی میں انجام دیکر لوگوں کو سکھائیں کہ انسان کے مقابلہ میں انکو اس طرح آزادی استعمال کرنی چاہیے اور انھیں بتائیں کہ اس آزادی کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے حتّٰی کہ اُس انسان کامل،

اُس عظیم الشان شخصیت کے مقابلہ میں بھی جس سے بڑی شخصیت نہ دنیا میں کبھی پیدا ہوئی نہ کبھی پیدا ہوگی

حضور فرماتے ہیں کہ:۔

اِنَّمَا انا بشرٌ اذا امرتکم بشیءٍ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیءٍ من رائی فانما انا بشرٌ	میں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تمکو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اُسے مانو۔ اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

ایک مرتبہ حضور نے کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا اور وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپ سے عرض کیا گیا تو فرمایا:

اِنی انما ظننت ظنًا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئًا فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ۔	میں نے تو اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری اُن باتوں کو نہ لو جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ لیکن جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اسکو لو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضور ابتداءً جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ مناسب نہ تھی۔ حضرت حباب بن المنذر نے آپ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کی بنا پر کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کر فلاں مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے۔ حضور نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیران بدر کے مسئلہ میں حضور نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکن جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمر نے آپ کی اور صدیق اکبر کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ اسی مجلس میں حضور نے خود اپنے داماد ابو العاص کا مسئلہ بھی پیش کیا اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر

تمہاری مرضی ہو تو ان سے فدیہ میں جو ہار لیا گیا ہے وہ انھیں واپس کر دیا جائے۔ جب صحابہ نے بخوشی اس کی اجازت دی تب آپ نے ہار انھیں واپس دیا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر حضور نے بنی غطفان سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجال کلام نہیں۔ اور اگر حضور اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضور نے اُنہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلحنامہ کا مسودہ چاک کر ڈالا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دب کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمر نے علانیہ اس سے اختلاف کیا۔ مگر جب حضور نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجودیکہ غیرت اسلامی کی بنا پر سب ملول تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اس غلطی کے کفارے طرح طرح سے ادا کرتے رہے کہ آپ نے ایک ایسے امر میں حضور سے اختلاف کیا جو بحیثیت رسول کیا جا رہا تھا۔

جنگ حنین کے موقع پر تقسیم غنائم میں آپ نے مولفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چین بجبیں ہوئے۔ حضور نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو چاہوں کروں، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرتا ہے۔ ان کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انھیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود حضور کی تصریح سے صحابہ کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہار رائے کرتے تھے، اور آپ خود اس آزادانہ اظہار رائے میں ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے

ایسے مواقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا، بلکہ آپ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپ خود بسا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔

اب حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا تعلق صرف نبی اور اُمتی ہی کا نہ تھا۔ بلکہ ایک تعلق یہ بھی تھا کہ آپ ان کے برادر نسبتی تھے اور وہ آپ کے بہنوئی تھے۔ اور ایک تعلق یہ بھی تھا کہ آپ اُن کے مربّی تھے۔ اور وہ آپ کے پروردہ تھے۔ بیوی سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ان کو وہی مشورہ دیا جو ہر برادر نسبتی اپنے بہنوئی کو اور ہر سرپرست اپنے پروردہ کو دیگا۔ یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلاف مزاج کی بنا پر زوجین میں تنافر تھا اس کو حضرت زید خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و اعتقاد کا نہیں بلکہ ان کے حیات نفس کا تھا اس لیے انہوں نے حضورؐ کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلاف ورزی رسولِ خدا کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسول خدا کی حیثیت سے تھا۔ اس لئے نہ آپ ناراض ہوئے نہ خدا ناراض ہوا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن سے پالا ہو اور اس پر احسانات کئے ہوں اور آخر میں غلامی سے واغدار ہونے کے باوجود خود اپنی بہن سے اس کی شادی کی ہو، اور پھر اس نے باوجود منع کرنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا۔ مگر حضورؐ صرف مربی اور صرف برادر نسبتی ہی نہ تھے بلکہ رسول خدا بھی تھے، اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلوائیں، اس لیے آپ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی ذات میں حیثیت

نبوی اور حیثیت بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم پیوستہ بھی تھیں۔ آپ نے ان دونوں کے استعمال میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک نبی ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے۔ حیثیت بشری میں بھی آپ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض بھی اسی کے ضمن میں ادا ہو جاتے تھے۔

سرکارِ رسالت مآب نے جس حرّیتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکام الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادی رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھایا تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابۂ کرام تمام انسانوں سے زیادہ احکام الٰہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں جو بڑے آدمی تھے، جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی رائے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادیٔ رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آقا کی پیروی میں اس کو نہ صرف گوارا کیا، بلکہ اس کی ہمت افزائی کی، اور کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں، اس لیے ہماری بات کو بے چون و چرا تسلیم کرو۔

خلفائے راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس نے اس حرّیتِ فکر کو تخویف اور اطماع، ظلم و ستم اور زر پاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی مگر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے

بعد بھی ایک مدت تک یہ روح مسلمانوں میں باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ امراء اور حکام کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتہً ایک چھوٹی چیز ہے۔ روح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے جس کی عزت وعظمت اس کے پہنائے قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کردے، اور اس کے مقابلہ میں بھی آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی اسپرٹ ہم کو اس دور کے اہل علم میں نظر آتی ہے صحابۂ کرام سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی۔ اور حضرات تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہوگا۔ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابۂ کرام کی آرا پر نقد کرتے تھے ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے کو قبول کرتے تھے۔ اختلاف صحابہ میں امام مالک کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خطأ وصواب فانظر فی ذالک۔ "ان کی آرا میں خطا بھی ہے، اور صواب بھی۔ تم خود غور کرکے رائے قائم کرو" اسی طرح امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے احد القولین خطأ والماثم فیہ موضوع۔ "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہرحال غلط ہوگا"۔

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کرکے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکر صدیق جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمادیتے کہ ھذا رائی فان یکن صواباً فمن اللہ وان یکن خطأً فمنی واستغفر اللہ۔ "یہ میری رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اگر غلط ہے تو میری خطا ہے۔ اور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں"۔

حضرت عمر فرماتے ہیں۔ لا تجعلوا خطأ الرأی سنۃ للامۃ۔ "رائے کی غلطی

کو امت کے لیے سنت نہ بنالو"۔

حضرت ابن مسعود کا قول ہے الا لا یقلدن احدکم دینہ رجلا ان امن امن و ان کفر کفر فانہ لا اسوۃ فی الشر۔ "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن رہا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہوگیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے"۔

امام مالک فرماتے ہیں۔ انما انا بشر اخطی و اصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔ "میں ایک انسان ہوں میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے میں نظر کرو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ اسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو"۔ امام مالک ہی کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی انکی کتاب الموطا کو تمام عالم اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کرکے صرف مذہب مالکی کو رائج کردے مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق اور آزادی رائے و اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں لا یحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا "کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہوتا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے"

امام شافعی فرماتے ہیں مثل الذی یطلب العلم بلا حجۃ کمثل حاطب لیل یحمل حزمۃ حطب وفیہ افعی تلدغہ وھو لا یدری۔ "جو شخص حجت کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چن رہا ہے۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہے

اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اس کو ڈس لے گا۔"

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریت فکر و نظر اور آزادانہ طلبِ حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امراء و حکام اور علماء و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا، درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ دل اور دماغ کی غلامی، فکر اور نظر کی غلامی، روح اور جسم کی غلامی ان پر پوری طرح مسلط ہو گئی۔ درباروالوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہوگا۔ جب غیر اللہ کے سامنے تا بہ زمین سر جھکنے لگیں، جب غیر اللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں، جب انسان کے سامنے نظر اٹھانا بھی سوءِ ادب ہو جائے، جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں، جب انسان انسان کا خداوند اور مالک اور اَن داتا بن جائے، جب انسان بذاتِ خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ و سنت رسول کے استناد سے بری قرار دیا جائے، جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے، جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی عملاً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے، تو پھر سمجھ لیجیے کہ آپ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے ساتھ دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی، اخلاقی، روحانی، ترقی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

مقالات

مسئلہ سود پر ایک معاشی نظر

(۳)

از جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

نفع سے انکار قومی جرم ہے | سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کے بچے کھچے سرمایہ دار، قلیل البضاعۃ اس حلال ہی بلکہ بالفاظ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ طیب آمدنی کو جسے میں "نفع" "یا" "پھاؤ" کہتا ہوں اور جس کے متعلق قرآن کا صریح حکم "کلوا حلالاً طیباً" ہے" نہ لے کر قومی جرم اور قومی خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے سرمائے جو بنکوں میں محفوظ ہیں ان کے لاکھوں روپیہ کا "نفع" صرف یہی نہیں کہ غیر اسلامی قوتوں کی بالیدگی ہے اور مسلمانوں کے لیے معاشی راہوں کے بدلنے سے ہر مال بیکار ہو جاتا ہے بلکہ سنا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اس "نفع" کی آمدنی سے مسلمانوں ہی کے بچوں، عورتوں، اور غریبوں، کو اسلام سے چھڑا چھڑا کر محمد رسول اللہ کی صف سے توڑ توڑ کر غیر رب کی صف میں بھرتی کیا جا رہا ہے کھلے بندوں،

یُخْرِجُونَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ "(ممتحنہ) "نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو۔ یہ کہ تم اپنے "رب" پر ایمان لائے"۔

کا ارتکاب ہو رہا ہے، یہ اپنے قوم کے ساتھ غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ ہائے مسلمانوں ہی کی چاندی

لہ ترجمان القرآن۔ محتاط علماء نے اس خیال سے کہ سود کی رقم بنک میں چھوڑ دینا کفار کے لیے موجب تقویت ہو جانے گا یہ فتویٰ دیا ہے کہ سود بنک سے لیکر غریب مسلمانوں پر صدقہ کر دیا جائے یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کسی کام پر خرچ کر دیا جائے۔ یہ فتویٰ نہایت درست ہے۔ فقہ میں مال محظور کے متعلق یہ مسئلہ موجود ہے کہ اگر غلطی سے ایسا

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۷

چھری سے مسلمانوں کا ذبح کرنا کس نے جائز قرار دیا؟ کیا خدا نہیں دیکھ رہا ہے؟ امام الدنیا والدین رسول رب العالمین خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبریں نہیں پہنچ رہی ہوں گی؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دنیا والو! دیکھو، سود کے جالوں میں پھنسا کر یورپ، پچھم، اُتر، دکھن، کے لوگ دل کھول کر شکار کر رہے ہیں۔ سود دو، یا کھیت دو یا جائداد دو، یا مکان دو، یا عرب کے امی لقب صلی اللہ علیہ وسلم کا آستانہ چھوڑو۔ ان مہروں کی شطرنج پر کیسی دردناک بازیاں کھیلی جا رہی ہیں[۱]۔

بنیک کا سود

سچ یہ ہے کہ بینک زیادہ تر سود خواروں کی باضابطہ کمیٹیوں کا نام ہے لیکن جب اس کا تنظیمی و اختیاری عملہ وہ نہیں ہوتا جن سے مسلمانوں کو روکا نہیں گیا ہے تو اب اس کمیٹی کی ممبری یا رکنیت نہیں ہے، بلکہ اس کمپنی سے معاملہ ہے جو لوگوں کو سود پر قرض دیتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اس طیب فئے سے انکار کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہ کمپنی کیا کرتی ہے؟ کس کو قرض دیتی ہے؟ کن سے سود لیتی ہے؟ یہ اس کا اپنا معاملہ اور جدید عقد ہے جس سے اس معاملہ کو قطعاً نسبت نہیں، جو ایک مسلمان نے ارباب بینک سے کیا ہے، بلکہ بین الملی قوانین کے جو دفعات آئین اسلامی سے گذر چکے ان کو سامنے رکھنے کے بعد بینک والوں کے سارے کاروبار جس کسی سے ہوں صحیح ہو جاتے ہیں[۲]۔ فلیتدبر۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۶ مال نے لیا گیا ہو، یا مجبوراً کسی مصلحت سے لینا پڑا ہو، تو اس کو صدقہ کر دینا چاہیے پس جو نقصان مولانا بیان فرما رہے ہیں اس سے بچنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ سود کو فئے قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

[۱] ترجمان القرآن۔ اس کا جواب مولانا نے خود ہی اپنے مضمون کے آخری حصہ میں دے دیا ہے۔

[۲] " " ۔ بنیک کے سود میں کراہیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہم جو رقم بنیک میں رکھواتے ہیں اس کو بنیک والے منجملہ اور معاملات کے، سودی قرض کے کاروبار میں بھی لگاتے ہیں، اور جن لوگوں کو یہ سودی قرض دیا جاتا ہے ان میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہوتے ہیں اس طرح جو سود ہم کو بنیک سے وصول ہوتا ہے وہ صرف غیر مسلموں ہی کی جیب سے نہیں آتا بلکہ مسلمانوں کی بھی جیب سے آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم مسلمان سے براہ راست سود نہیں کھاتے بلکہ بنیک کے واسطے سے کھاتے ہیں۔ مولانا اس اعتراض کو یہ کہکر رفع فرماتے ہیں کہ "حربی" بنیکر نے خود ہماری امانت کے روپے میں سے جب کسی مسلمان کو قرض دیا اور اُس پر سود وصول کیا تو یہ سود کی رقم جائز طور پر اس کی ملک ہو گئی۔ اب اس کے بعد جب ہم نے اُس سے اپنی اسی امانت پر سود وصول کیا تو گویا ہم نے "حربی" کے مال پر (جو ہمارے لیے مباح اور حلال وطیب ہے) قبضہ کیا۔ اب یہ سوال باقی رہ گیا کہ جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ یہ کافر حربی خود ہمارے دیے ہوئے ہتھیار سے مسلمانوں کو ذبح کرتا ہے، اور پھر ان کے گوشت میں سے ہم کو بھی (۱۷) حصہ دیتا ہے۔ تو ہم اپنا ہتھیار اس کو دیں ہی کیوں؟ مولانا نے اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

ہاں میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ جو ایسا کرتے ہیں وہ وطن کی پاسبانی نہیں کر رہے ہیں۔ وطن والوں کے ساتھ وطن کے مزدوروں کے ساتھ، غریبوں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہیں لیکن جو وطن کا محافظ ہے، جس حکومت کو وطن کے باشندوں کی نگرانی سپرد کی گئی ہے جب وہی ان معاملات کو وطن کی بہبودی اور ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے اور خود وطن والے بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں تو مسلمان وطن کی وفاداری میں کیا اپنی قوم سے غداری کریں؟ حالانکہ وطن تو وطن ان پر تو خاندانی حقوق کے سلسلہ میں بھی قومی غداری حرام ہے قرآن کا عام اعلان ہے۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم یوم القیمۃ یفصل بینکم واللہ بما تعملون بصیر (الممتحنہ)

تمہارے رشتے اور تمہارے بچے قیامت کے دن کام نہیں آئیں گے خدا تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں صبر کا حکم دیا گیا ہے اور خاص وقت تک صبر ہی ہمارے لیے بہتر ہے لیکن کیا قانون صبر کے ساتھ "مجازاۃ بالمثل" کی بھی قرآن ہی نے تعلیم نہیں دی ہے :-

فان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم فھو خیر للصابرین

اگر تم پر زیادتی کی جائے تو تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو جتنی تم پر کی گئی اور اگر صبر کروگے تو صبر کرنے والوں کے لیے بھی بہتر ہے

لیکن صبر کی کوئی نہایت بھی ہے؟ استقلال کی کوئی حد بھی ہے؟ جس نے صبر سکھایا اسی نے تو

لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ

اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

لہ ترجمان القرآن - اس مسئلہ میں وطن کی وفاداری یا قوم کی غداری کا قطعاً کوئی سوال نہیں۔ اہل ایمان صرف اس بنا پر سود سے باز رہے ہے کہ خدا نے اس کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ آپ اس روک کو ہٹا دیجیے۔ پھر کسی اور دلیل کی حاجت نہ رہے گی۔ سرحدی پٹھان کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی سود خواری میں مارواڑی سے دس قدم آگے ہوں گے۔

بھی سکھایا قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے سونے والے یورپ کے غازی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو تہلکہ کی تفسیر فرمائی ہے عوام نہیں تو کیا اس سے خواص بھی جاہل ہیں؟ بلکہ سوچنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اس نفع کا نہ لینا صرف اپنی قوم کے ساتھ ہی | نفع کا نہ لینا وطنی جرم بھی ہے نہیں بلکہ وطن والوں کے ساتھ بھی دشمنی ہے۔ زہر کھانے والے کو دیکھ کر صرف دل میں افسوس کرنا یہ حقیقی ہمدردی ہے؟ یا آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے زہر کا چھین لینا ہی بہی خواہی ہے؟ [1]

من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده وان لم يستطع فبلسانه وان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان۔

تم میں سے کوئی بری بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدلے نہ زور رکھتا ہو تو زبان سے اسے پلٹے اس کی بھی مجال نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ بڑے کمزور ایمان والا ہے۔

حدیث کی ساری کتابوں میں سکھتے ہو لیکن پھر بھی ایمانی ضعف کے دائرے سے نکلنے کی لوگوں میں جرأت نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب استطاعت بھی ہو، حکومت کی قوت تمہارے ساتھ ہو، وطن والے اس معاملہ میں تمہارے ہمنوا ہوں تو بتاؤ تمہارے لیے کیا عذر باقی رہا؟ کیا جو لوگوں کے گال پر تھپڑ مارتا ہے وہ جرم کے نتائج و آثار کو اس وقت تک سمجھ سکتا ہے جب تک خود اس کے رخساروں کو بھی اسی گزند کی خوراک نہ دی جائے جس کو اب تک اس نے نہیں چکھا ہے؟ [2] اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو وہ

---

[1] ترجمان القرآن۔ زہر چھین لینا تو ضرور بہی خواہی ہے مگر اسے چھین کر خود کھا جانا اور پھر اس زہر کو کشتہ طلا سمجھنا۔ نہ بہی خواہی ہے نہ عقلمندی۔

[2] ترجمان القرآن۔ ہندو، یہودی، عیسائی، سب آپس میں ایک دوسرے کے گال پر یہ تھپڑ مار رہے ہیں، اور صدیوں سے مار رہے ہیں۔ مگر یہ گزند کی خوراک چکھنے اور چکھانے کے باوجود وہ اس کے نتائج و آثار کو نہیں سمجھتے پھر کیونکر امید کی جائے کہ مسلمانوں کے چند ہلکے سے تھپڑ ان کو اس قدر چونکا دیں گے کہ وہ اس جرم ہی سے باز آجائیں گے؟ مولانا غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ سود دینے والے صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم صرف سود لیتے ہی ہیں دیتے نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کا یہ خیال ہے کہ جب مسلمان بھی سود دینے پر اتر آئیں گے تو سود خوار غیر مسلم گھبرا اٹھیں گے اور بالآخر برٹش گورنمنٹ

بقیہ حاشیہ بر صفحہ (۲۰)

بچارے غریب انسانوں کی نازک کھالوں کو اپنی انگلیوں میں قوت پیدا کرنے کی مشق گاہ خیال کرے گا۔" فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ؟

ہو سکتا ہے کہ جو گزند آج مسلمانوں کو پہونچایا جارہا ہے جب اس کا احساس دوسروں کو بھی ہوگا تو ممکن ہے کہ حکومت ہی ان معاملات کو قانوناً بند کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اس وقت سب سے پہلے اس قانون کی تعمیل کے لیے جن کا سر مذہب جھکا دے گا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی جو دنیا میں اعلیٰ اور برتر مکارم اخلاق کی تکمیل ہی کے لیے مبعوث ہوا تھا۔ نحن احق بمکارم الاخلاق "ہم مسلمان سب سے پہلے عمدہ اور بلند اخلاق کے حقدار ہیں" اس وقت ہم مذہب کے مجرم ہوں گے اگر قانون وقت کے ساتھ عذر کریں گے، اگر حکومت نے بھی نہ سنا تو کیا تم تعجب کرتے ہو کہ جو دکھ مسلمانوں کو پہنچا جب اسی میں دوسرے تڑپیں گے تو "دمن توپ" کے اس وعظ سے وطن والے اسی طرح لاپروائی برتیں گے جس طرح وہ زبان و قلم کے واعظوں پر قہقہے لگاتے رہے ہیں[1] اگر انہوں نے آگے چل کر ہم سے ان معاملات کے اٹھا دینے کا کبھی معاہدہ کیا تو کیا مسلمانوں کو ان کے خدا نے اس کی اجازت نہیں مرحمت فرمائی ہے۔ کہ

تکملۂ حاشیہ صفحہ ۱۹ سودی لین دین کو قانوناً ممنوع قرار دے دے گی مگر صورت واقعہ یہ نہیں ہے۔ تمام غیر مسلم قومیں سود لیتی بھی ہیں اور دیتی بھی ہیں۔ مسلمان ان سے سود لے کر انہیں کوئی نیا مزہ نہیں چکھائیں گے۔ البتہ خود ایک نیا مزا ضرور چکھیں گے جو ممکن ہے کہ انہیں بے خود کر کے "بھاؤ" اور "غیر بھاؤ" کے فرق سے غافل کر دے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ مسلمان کچھ ایسے بڑے سرمایہ دار بھی نہیں ہیں کہ اگر وہ سود دینے پر اتر آئے تو نادار واڑیوں اور مہاجنوں کے دیوالے نکلنے کی نوبت آجائے گی، اور یہ سب کے سب ارمان کر حرمت سود کا قانون بنوانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

[1] ترجمان القرآن۔ ان کے قہقہے پھر بھی بند نہ ہوں گے بلکہ وہ ایک اور زور کا قہقہہ لگائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ آخر کار معاشی اور مالی معاملات میں اسلام کا ناقابل عمل ہونا ثابت ہو گیا اور یہ بات کھل گئی کہ سود کی حرمت عملی دنیا میں چلنے والی چیز نہیں جس طرح طلاق اور وراثت اور نکاح ارامل وغیرہ مسائل میں آپ ان کے مذہبی قانون کی جدید ترمیمات پر فخر کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی اسلام کی "کمزوری" کا اشتہار دینے کے لیے سود کے مسئلہ میں آپ کی بدلی ہوئی روش کو ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کریں گے۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

اللہ تم کو ان لوگوں سے نہیں روکتا جو دین میں تم سے نہیں جھگڑتے اور تمکو وطن سے بے وطن نہیں کرتے کہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو۔ انصاف کرنے والوں کو خدا پیار کرتا ہے۔

ایسے معاہدوں پر جو اُمّت سب سے پہلے دستخط کرے گی وہ وہی ہوگی جو تمام دنیا کے لوگوں کو نفع پہونچانے کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔ ہم دل سے بھی ان معاملات کو بُرا جانیں گے، زبان سے اس پر اصرار کریں گے، حکومت کو بھی ادہر بار بار توجہ دلائیں گے، وطن والوں سے بھی کہیں گے۔ جس طرح اب تک کہا ہے، آئندہ بھی کہیں گے، زور سے کہیں گے، اور مسلسل کہیں گے۔ ہم کو وطن سے بے وطن اور اپنے گھروں سے بے گھر بنانے پر وہ جس قدر بھی چاہیں اصرار کریں، لیکن ہم ان کی بہی خواہی میں کبھی کمی نہ کریں گے اور اسی بہی خواہی کے سلسلہ میں زبان سے آگے بڑھ کر ہم ہاتھ سے بھی اپنے:۔

"نہی عن المنکر" "بری باتوں سے روکنا"

اور "امر بالمعروف" "اچھی جانی پہچانی باتوں کا حکم دینا"[1]

کے آسمانی فریضہ کو ادا کریں گے جس کے لیے ہم بنائے گئے ہیں .... تا آنکہ وطن کے

---

[1] ترجمان القرآن۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ طریقہ تو نہایت ہی عجیب ہے کہ جس منکر سے ہم دوسروں کو روکنا چاہتے ہیں اسی میں خود مبتلا ہو جائیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص شراب پی کر دنگا فساد کرتا ہو اور نصیحت سے نہ مانے تو ہم خود اس کے ساتھ بیٹھکر شراب پئیں اور ویسا ہی دنگا فساد مچا کر اس سے کہیں کہ دیکھو اس حرکت سے یہ تکلیف ہوتی ہے۔ اب یا تو ہم سے معاہدہ کرو کہ نہ تم شراب پیوگے نہ ہم پئیں گے یا نہیں تو یاد رکھو کہ ہم تم سے زیادہ شراب پیکر اور تم سے زیادہ دنگا کرکے دکھائیں گے۔ اس طریق نصیحت سے ترک میخواری کا معاہدہ تو شاید نہ ہو، البتہ ہوگا یہ کہ زاہد کو در میخانہ پہ دیکھ کر رندمیخوار ایک نعرہ فتح بلند کرے گا۔ اور پکار اٹھے گا کہ میکشوں کی ٹولی میں شیخ کی آمد مبارک!

فرزندوں کا، ہمارے پڑوسیوں کا اس کی خرابی و ضرر رسانی پر اتفاق ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے دل یونہی مل گئے اور وہ تو ان شاء اللہ ایک دن مل کر ہی رہیں گے۔

اسلامی حکومتوں اور ریاستوں کا حکم

مسئلہ ختم کرنے سے پہلے چند باتیں اور بھی قابل ذکر رہ جاتی ہیں آخر ان کو کیوں چھوڑا جائے؟ جب اسلامی قوانین ہماری رہنمائی و دستگیری کے لئے ہر حال میں تیار ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن اسلامی ممالک میں شرعی قانون کسی نہ کسی وجہ سے اٹھ گیا ہے ان کا کیا حکم ہے؟ وہاں کے حکام و ولاۃ سلاطین و ملوک تو مسلمان ہیں۔ شامی میں اس کا فتویٰ موجود ہے کہ اگر سلاطین اسلام ان ممالک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی قوۃ رکھتے ہیں اور باوجود اس کے نفاذ نہیں کرتے، تو آیا ملک دارالاسلام ہی رہے گا، کہتے ہیں :۔

وبهذا ظهر ان ما في الشام من جبل تيم الله المسمى بجبل الدروز وبعض البلاد التابعة له كلها دار اسلام لانها وان كانت لها حكام دروز او نصارى ولهم قضاة على دينهم وبعضهم يعلنون بشتم الاسلام والمسلمين لكنهم تحت حكم ولاة امورنا - وبلاد الاسلام محيط ببلادهم من كل جانب واذا اراد ولي الامر تنفيذ احكامنا فيهم نفذها۔ (ص شامی ج ۳)۔

اور اس سے معلوم ہوا کہ شام کا علاقہ کوہ تیم اللہ جس کا عام نام جبل دروز ہے اور دوسرے شہر جو اس کے تابع ہیں سب دارالاسلام ہیں کیونکہ اگرچہ وہاں دروزیوں کا یا عیسائیوں کا قانون ہے اور ان کے جج و حکام ان ہی کے مذہب کے ہیں اور ان میں بعض علانیہ مسلمانوں کو اور اسلام کو گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ اسلامی حکومت کے ماتحت ہیں اور اسلامی ممالک ان کو چاروں طرف سے محیط ہیں اور مسلمانوں کا امیر اگر چاہے تو ان میں ہمارے (یعنی اسلامی احکام) نافذ کر سکتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جن ممالک میں مسلمان سلاطین یا ولاۃ امور باوجود ارادہ کے اسلامی احکام

کے نفاذ پر قادر نہوں وہ دار الاسلام باقی نہیں رہ گئے[1]۔ واللہ اَعْلَمُ بالصَّوَاب۔

باقی یہ مسئلہ کہ اس قسم کے غیر اسلامی ممالک میں جمعہ، عید، وغیرہ کا نظم کس طرح ہوگا، شامی میں اس کے متعلق موجود ہے:۔

كل مصر فيه والٍ مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمع والاعياد وأخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الايامى۔ (ص ..) ناقلا عن جامع الفصولين۔

ہر وہ شہر جہاں کا رئیس کفار کی منظوری سے ہو اس کی جانب سے جمعہ اور عید کا قیام کرنا جائز ہے اور اس ملک کا خراج لینا بھی نیز عدالت کے قضاۃ (حکام) کے تقرر کا بھی اسے اختیار ہے، اور بیواؤں کی شادی بھی وہی کر دے۔

لیکن جب غیر اسلامی ملک میں غیر اسلامی حکومت کا کوئی تسلیم شدہ مسلمان رئیس نہ ہو تو اس کے متعلق یہ حکم ہے:۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ مولانا کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی ریاستیں بھی دار الحرب کی تعریف میں داخل ہیں اور ان کی غیر مسلم رعایا بھی حربی ہے جس کے اموال مباح ہیں۔ اس اجتہاد کے لئے کم از کم فقہ حنفی میں تو کوئی گنجائش ہے نہیں۔ فقہا کی تصریحات ملاحظہ ہوں: حواشی در المختار للطحاوی میں ہے لو اجريت احكام المسلمين واحكام الشرك لا تكون دار الحرب۔ فتاوی بزازیہ میں ہے فاذا وجدت الشرائط كلها صارت دار الحرب وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ما كان ويترجح جانب الاسلام احتياطاً۔ خزانۃ المفتین میں ہے ان دار الاسلام لا تصير دار الحرب متى لم يبطل جميع ما صارت به دار الاسلام ... فما بقي علقة من علائق الاسلام يترجح جانب الاسلام۔ ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ حیدرآباد اور بھوپال اور جوناگڈھ وغیرہ ریاستیں دار الحرب ہو گئی ہیں اور ان کی غیر مسلم رعایا حربی ہے۔ مولانا جانتے ہوں گے کہ فقہ اسلامی میں دار الحرب دار الاباحۃ کا دوسرا نام ہے جہاں عارضی طور پر قانون اسلامی کی اکثر بندشیں ضرورۃً کھول دی جاتی ہیں اگر ان عارضی اباحتوں کو استمراری حیثیت دے دی جائے تو مسلمانوں کا مسلمان رہنا غیر ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر لارڈ ولزلی کے سبسیڈیری الائنس میں شریک ہونے کے بعد سے علماء اسلام حیدرآباد کو دار الحرب قرار دے کر دار الاباحت بنا دیتے تو ۱۲۶ برس کے اندر اس ریاست کے مسلمان اس قدر مسخ ہو چکے ہوتے کہ آج ممالک اسلامیہ کا کوئی شخص ان کو پہچان بھی نہ سکتا کہ یہ مسلمان ہیں۔

واما فی بلاد علیها ولاة کفار فیجوز لیکن ایک ایسا ملک جہاں کے ولاۃ کفار ہیں تو مسلمانوں
للمسلمین اقامة الجمع والاعیاد ویصیر کو یہ جائز ہے کہ اس شہر میں بھی خود جمعہ اور عیدین
القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب قائم کریں، قاضی مسلمان باہمی سمجھوتہ سے مقرر کریں،
علیهم طلب والی مسلم (صفا لیفنا) لیکن ان پر مسلمان رئیس کی تلاش واجب ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن مسائل میں مسلمانوں کو "قضاء شرعی" کی ضرورت پیش آتی ہے "دین کامل" نے غیر اسلامی ممالک میں اس کا کیا چارہ کار بتایا ہے، اور غالباً اس تفصیل کے بعد عہد حاضر کے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے احکام واضح ہوگئے، فللہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ وصلی اللہ علی النبی الخاتم المرسل وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خاتمہ

اس وقت تک جو کچھ کہا گیا وہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کی توضیح تھی ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ دوسرے ائمہ کے نقاط نظر کو بھی ہم پیش کریں گے۔ بالفعل اتنی عرض ہے کہ مندرجہ بالا مواد و مقدمات کو پیش نظر رکھ کر علماء احناف کو غور کرنا چاہیے کہ وہ حنفیوں کے لیے کیا راہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالعزیز کے ان فتووں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو فتاوی عزیزیہ کے مختلف مقامات پر درج ہیں۔

؎ لیکن سچ یہ ہے کہ بجز حجۃ الوداع کی حدیث کے ان کا استدلال کسی چیز سے نہیں ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دارالاسلام ہونے اور امن و ذمہ دینے کے بعد اس قسم کے تمام معاملات حرام ہوجاتے ہیں، باقی یہ کہنا کہ گذشتہ کیوں نہیں دلایا گیا تو اس قسم کا مال قبضہ سے پیشتر صرف مباح ہوتا ہے ملک میں نہیں آتا۔ جب مملوک ہی نہ ہوا تو حق ہی کیا تھا جو ملتا۔ بعضوں نے لو (دمنہا حرم الربا ینوت) والی آیت سے استدلال کیا کہ یہودی بھی تو دارالحرب میں اس کا کاروبار غیر یہودیوں سے کرتے ہوں گے۔ اگر یہ صورت جائز ہوتی تو قرآن سب منع کرنے کے لئے کیوں کہتا۔ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ مسئلہ حلت غنیمت پر مبنی ہے اور غنیمت کا استحلال صرف امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے فلینظر الی کتب الحدیث۔ ۱۲۔

مسئلہ سود و قرض کی مزید تشریح

(اس مضمون کی اشاعت کے بعد غالباً مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی یا کسی اور صاحب نے مولانا کی تعبیر قانون پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہوں گے جن کے جواب میں یہ تکملہ بعد میں لکھا گیا ہے افسوس ہے کہ وہ اعتراضات نہ ہم کو مل سکے اور نہ ہماری نظر سے گذرے، تاہم مولانا کے جواب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اعتراضات کیا ہوں گے۔ ایڈیٹر)

(۱) مسئلہ کی تعبیر میں ضرور مسامحت ہوئی ہے جس سے شدید غلط فہمی کا اندیشہ ہے ارقام فرمایا گیا ہے کہ "غیر اسلامی حکومتوں کے ماتحت ربوا، ربوا، نہیں رہتا" الخ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی میں ہر شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کے ساتھ اس قسم کے معاملات جائز ہیں، اور ان کے اموال غیر معصوم و مباح ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مقصد یہ نہیں ہے بلکہ یہ حکم صرف ایسی غیر اسلامی اقوام مثلاً یہود و نصاریٰ مجوس و ہنود وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے جن کی ذمہ داری کسی اسلامی حکومت نے نہیں لی ہے میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں امام محمدؒ کی "سیر کبیر" کا مشہور فتویٰ نقل کیا ہے اسی سے غایت اطمینان کے لیے اس قانون کی یہ دفعہ بھی نقل کر دیتا ہوں۔

ولو كانت هذه المعاملة بين المسلمين مستأمنين أو أسيرين في دار الحرب كان باطلا مردودا لانها يلتزمان احكام الاسلام في كل مكان۔ (سیر کبیر ج ۳ ص ۲۲۶)

اور اگر یہ معاملہ دو مسلمانوں کے درمیان ہو جو دار الحرب (غیر اسلامی ملک) میں معاہدہ امن کر کے مقیم ہوں، یا قیدی ہوں، تو یہ معاملہ باطل اور مردود ہوگا کیونکہ یہ دونوں اسلامی قوانین کے ہر جگہ ذمہ دار ہیں۔

قیدی یا اسیر کے لئے فقہی طور پر ضروری نہیں کہ وہ جیل خانہ میں ہو بلکہ ہر وہ شخص جو کسی ملک سے دوسرے ملک میں بغیر اجازت یا پاسپورٹ کے نہیں جا سکتا وہ اسیر ہے[۲] والتفصیل ان شاء اللہ فی وقت اخر۔

(۲) دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ بلاشبہ میں نے ذرا عجلت سے کام لے کر اس مضمون کو قبل از مشورہ شائع کرا دیا۔ اس عبد خاطی و عاجز کو اپنے اس قصور کا اعتراف ہے لیکن میں نے جن جذبات اور ہیجانات سے مجبور ہو کر اس مضمون کو لکھا تھا اس سے خدائے خبیر و بصیر خوب واقف ہے۔ ماسوا اس کے اس مسئلہ کی بنیاد جن مقدمات پر ہے وہ کل دو[۲] ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان دار الکفر ہے۔ دوسرے یہ کہ دار الکفر میں عقود فاسدہ فی الاسلام کے ذریعہ سے اموال غیر معصومہ کا لینا مباح ہے۔

ان میں سے پہلے مقدمہ کے متعلق میں نے ہندوستان کے اکثر علماء ثقات و ارباب فہم و تقوی کو متفق پایا تھا البتہ دوسرے مقدمہ کے متعلق میں نے ان کرام و اکابر علماء نے بالتفصیل نہیں

---

[۱] ترجمان القرآن۔ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے دو شہری علاقہ غیر میں ایک دوسرے سے سود نہیں لے سکتے۔ لیکن دار الاسلام کی رعایا کا کوئی مسلمان فرد اگر دار الحرب میں امان لے کر جائے تو وہ دار الحرب کے مسلمان باشندے سے سود لے سکتا ہے، کیونکہ فقہ حنفی میں کافر حربی کی طرح اس مسلمان کا مال بھی معصوم نہیں ہے۔ بحر الرائق میں ہے وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یہاجر کالحربی عند ابی حنیفہ لان مالہ غیر معصوم عندہ فیجوز للمسلم الربا معہ (جلد ۶ ص ۱۴۷) اس لحاظ سے مولانا کی تعبیر کے مطابق سرحدی پٹھانوں کے لئے ہندوستان میں نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ مسلمانوں سے بھی سود لینا حلال و طیب ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہاں کے مسلمانوں سے جوا بھی کھیل سکتے ہیں اور حرام چیزیں بھی ان کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں (کما فی الفتح ج ۵ صفحہ)

[۲] ترجمان القرآن۔ اگر اسیر کی تعریف صرف اتنی ہی ہے تو ہندوستان کے تمام مسلمان مستامن نہیں بلکہ اسیر قرار پائیں گے، اور اسیر کے احکام مستامن کے احکام سے بالکل مختلف ہیں۔ اسیر کے لئے قانون ملک کی پابندی بھی لازم نہیں۔ وہ چوری، قتل، ارتشاء وغیرہ کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ بحر الرائق میں ہے لان الاسیر یباح لہ التعرض وان اطلقوہ طوعاً لانہ غیر مستامن فھو کالمتلصص فیجوز لہ اخذ المال وقتل النفس دون استباحۃ الفرج (ج ۵ ص ۱۰۷) اگر قانون کے مقاصد سے قطع نظر کر کے صرف اس کے الفاظ سے غرض رکھی جائے تو آزادی عمل کی اس سے بھی زیادہ گنجائشیں نکل سکتی ہیں۔

دریافت کیا، جن کے اسمائے گرامی آپ نے درج کیے ہیں، اور جن میں سے اکثر اس خاکسار کے اساتذہ یا فی حکم الاساتذہ ہیں۔ صرف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی کی رائے گرامی کا مجھے علم تھا۔ کہ وہ اس مسئلہ میں فقہ حنفی کے اس جزئیہ کے متعلق مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فتاوی نیز تفسیر میں دوسرے مقدمہ کی صحت میں حدیثاً و اصولاً کلام کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس ناچیز کی رسائی تھی امام ابوحنیفہ کے مسلک کو میں نے اوفق بالکتاب والسنۃ پایا۔ امام صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح "لاتقتلوا انفسکم" "اپنی جانوں کو نہ مارو" کا منصوص اور بظاہر عام حکم صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ ورنہ قانون جہاد بے معنی ہو جاتا ہے، اسی طرح "ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" "تم اپنے مالوں کو اپنے درمیان ناجائز ذرائع سے نہ کھایا کرو" اور اسی کی ایک ذیلی تفصیل "لاتاکلوا الربوا" "سود نہ کھاؤ" کا بظاہر عام حکم بھی صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے[1]۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ مولانا کے اس بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خون کا احترام، اکتساب اموال میں حرام و حلال کی تمیز، اور سود کی حرمت سب کچھ صرف مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہے۔ دائرہ اسلام کے باہر نہ تو غیر مسلم انسانوں کے خون کی کوئی وقعت ہے اور نہ ان سے مالی معاملات میں حلال و حرام کی کوئی تمیز۔ اس سے بڑھ کر اسلامی قانون کی غلط نمائندگی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ اس آیت کی رو سے ہر انسان کی جان اصلاً قابل احترام ہے۔ اس کے حلال ہونے کی صورت صرف یہ ہے کہ حق اس پر قائم ہو جائے۔ جہاد میں یہ حرام اُسی طرح "حق" کی خاطر حلال ہو جاتا ہے جس طرح قصاص میں خود مسلمان کا حرام خون بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اگر اصولاً کافر غیر ذمی کو اسلام نے "حربی" قرار دیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام اور جماعت سے الگ ہو کر ہر مسلمان ہر غیر ذمی کافر پر جب چاہے "حق" قائم کر دے اور جہاں چاہے اسے قتل کر دے اور لوٹ لے۔ اگر ایسا ہو تو ایک مسلمان اور ایک انارکسٹ میں کیا فرق باقی رہا؟ اسی طرح مال کھانے اور خرچ کرنے کے جو طریقے اسلام نے حرام کیے ہیں وہ سب قطعی طور پر حرام ہیں۔ ان میں یہ امتیاز نہیں ہے کہ مسلمان سے مال لینے کا جو طریقہ حرام ہو، کافر سے مال لینے کا وہی طریقہ حلال ہو۔ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بها الى الحكام لتاكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔ اور احل الله البيع وحرم الربوا۔ اور انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان۔ ان احکام میں سے کس حکم کو صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے؟ اگر مسلمانوں کا یہی مسلک ہو کہ شراب کو حرام بھی کہیں اور پھر غیر مسلموں کے ہاتھ بیچیں بھی، جوے کو حرام بھی کہیں اور غیر قوموں سے کھیلیں بھی، سور کو حرام بھی کہیں اور سور کھانے والوں کے ہاتھ فروخت بھی کریں، سود کی حرمت پر تقریریں بھی کریں اور پھر غیر مسلم قوموں سے سودی لین دین کو حلال و طیب بھی سمجھیں، تو دین اسلام ایک مضحکہ بن جائیگا اور کوئی صاحب عقل ایسے مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا اس غلط تعبیر کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں، حالانکہ انہوں نے ان عام احکام میں جو استثناء تجویز کیا ہے وہ صرف خاص جنگی ضروریات میں ان لوگوں کے لئے ہے جو مبتلائے حالات جنگ ہوں۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کی پوری پوری آبادیاں مستقل طور پر غیر قوموں کے ساتھ تجارتی و مالی معاملات میں حرام و حلال کی تمیز اڑا دیں اور نسل در نسل اور پشت در پشت اسی حرام خوری پر زندگی بسر کرتی رہیں۔

خصوصاً جب "اموال محرمہ" کے حکم ہی میں "بینکم" کی تصریح بھی ہے تو وہ قانون قتل کی عمومیت سے اور بھی زیادہ خاص ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ "ربو" کا قانون سخت ہے لیکن کیا قتل سے بھی زیادہ سخت! قرآن نے ایک شخص کا قتل تمام بنی آدم کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے جس کی جزا میں جہنم کے عذاب، خلود ابدی کی دھمکی دی گئی ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسلام نے اس سخت قانون کے ایک رخ کو اسی رخ کو جو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک "اموال" کے متعلق ہے، ثواب اور بڑا ثواب قرار دیا ہے۔ آخر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے؟ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:-

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا۔ اللہ تم سے مغانم کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم لوگے۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ اموال مسلمان خریدیں گے؟ یا وراثت میں پائیں گے؟ یا ان کو کوئی ہبہ کرے گا؟ پھر یہ زور ہی نہیں بغیر زور و قوت کے بھی جو مال ملے اس کے متعلق تصریح ہے کہ یہ وہ چیز ہے، کہ

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ۔ الحشر

جو لوٹایا خدا نے اپنے رسول کے پاس تو تم نے نہ اس پر اونٹ دوڑائے نہ گھوڑے لیکن اللہ اپنے رسول کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔

صرف جنگ کے موقع پر اس کا وعدہ نہیں کیا گیا، بلکہ سب کو معلوم ہے، کہ

اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ۔ جب اللہ نے تم سے دو گروہوں میں سے ایک گروہ کے متعلق یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہارے لیے ہے۔

ان طائفوں میں کون نہیں جانتا کہ خدا نے اس طائفہ کا بھی وعدہ کیا تھا جو "عیر" یعنی قافلہ تجارت تھا! اور کیا وعدہ کیا تھا؟ "انھا لکم" وہ تمہارے لیے ہیں مسلمانوں کے لیے و بذریعہ بیع و فروخت، تجارت، ہبہ، وراثت، ہدیہ، صدقہ، خیرات، آخر کس طور پر وعدہ

کیے گئے تھے؟[1] یہی ذریعہ اگر مسلمانوں کے لیے اموال کے حصول کا قرار دیا جائے تو کیا وہ ذریعہ ذریعہ باطل اور " لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل " کے نیچے داخل ہو گا۔ بخاری میں ہے کہ حضرت ابو بصیر صحابی رضی اللہ تعالی عنہ کو صلح حدیبیہ کی رو سے جب مدینہ میں رہنے کی اجازت نہ ملی تو وہ سمندر کے کنارے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جم گئے اور ان کا شغلہ کیا تھا۔ امام بخاری راوی ہیں۔

فواللہ ما یسمعون بعیر خرجت لقریش الی الشام الا اعترضوا لھا فقتلوھم واخذوا اموالھم: لہ

بخدا قریش کے جس قافلے کے متعلق وہ سنتے کہ شام کی طرف نکلا ہے اس سے وہ تعرض کرتے اور اہل قافلہ کو قتل کر کے ان کے اموال چھین لیتے۔

کیا اس سے بھی زیادہ تشریح کی ضرورت ہے؟[2] قرآن میں تو صرف " عہد " کا وعدہ تھا لیکن یہاں تو وقوع ہوا۔ کیا یہ قانون فقہ حنفی کا ہے یا نصوص بینہ کا مقتضیٰ ہے؟ عجیب بات ہے کہ جس قانون کے ذیل میں امام صاحب نے اس جزئیہ یا دفعہ کو پیدا فرمایا ہے، (یعنی قانون غنیمت) وہ تو صرف امت محمدیہ کے لیے بروے روایات صحیحہ مخصوص مانا جاتا ہے، لیکن پھر بھی لوگ کہے جاتے ہیں کہ اگر " ربو " کا کاروبار غیر اقوام کے ساتھ جائز ہوتا تو اللہ تعالی نے یہودیوں کے متعلق قرآن مجید میں کیوں فرمایا:۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ یہ ایک برسر جنگ قوم کا تجارتی قافلہ تھا۔ گو بالفعل مقاتل نہ تھا۔ غنیم کی تجارت میں مزاحمت کرنا، اس کے تجارتی جہازوں یا قافلوں کو پکڑ لینا، اور اس کے اموال پر قبضہ کر لینا قانون جنگ میں بالکل جائز ہے مولانا کوئی ایسی مثال پیش فرمائیں جس میں ماسوا حالت جنگ کے غیر ذمی کافروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مطلقاً مباح الدم و الاموال قرار دیا گیا ہو۔ اور فرداً فرداً ہر مسلمان کو یہ حق بخش گیا ہو کہ جس غیر ذمی کو وہ جب جہاں پائے لوٹ لے۔

[2] ترجمان القرآن۔ یہ ایک شدید حالت اضطرار کی مثال ہے۔ قریش ایک طرف تو ان مسلمانوں کو ظلم و ستم سے مارے ڈالتے تھے دوسری طرف صلح حدیبیہ کی رو سے انہوں نے ان کے لیے مدینہ جانے کی راہ بھی بند کر دی تھی۔ ایسی حالت میں یہ اپنی جان بچانے اور زندہ رہنے کے لیے بے قاعدہ جنگ پر مجبور تھے اور قریش نے خود ہی اپنے ظلم سے ان کو حفاظت خود اختیاری میں سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس مثال سے اباحت اموال کے اس وسیع نظریہ کی تائید کیونکر نکلتی ہے جسے مولانا پیش فرما رہے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ
اور یہودیوں کے سود لینے کی وجہ سے جس سے وہ روکے گئے اور لوگوں کے اموال کو باطل و ناجائز ذرائع سے کھانے پر۔

جب یہودیوں پر غنیمت ہی حرام تھی[1] تو پھر کس بنا پر ان کے لیے سود جائز ہوتا۔ اور یہ بھی اسی وقت کہا جائے گا جب یہ ثابت ہولے کہ وہ صرف غیر یہودیوں سے اس کا کاروبار کرتے تھے[2]۔ مولانا شبلی نے اپنی سیرت میں ابوداؤد کی روایت کو متعدد بار نقل فرمایا ہے۔ اس سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا چاہیے۔ کیونکہ اس تشدد کی بنیاد مسئلہ غلول (یعنی قبل تقسیم کے اموال غنیمت میں تصرف کرنے) پر ہے، جیسا کہ خود حضرت سمرہ بن جندب نے "کابل" کی جنگ میں اس کی توضیح فرما دی۔ ابو لبید راوی ہیں کہ ہم لوگ کابل میں سمرہ بن جندب کے ساتھ تھے۔ لوگوں کو مال غنیمت ہاتھ آیا تو لگے لوٹنے حضرت سمرہ اس پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، کہ آپ نے "نہبی" سے منع فرمایا، لوگوں نے سب مال واپس کر دیا۔ پھر حسب تقسیم شرعی انہوں نے بانٹ دیا۔" (مجمع الفوائد) اس میں یہ نہیں ہے کہ اصل مالکوں کو واپس دیدیا بلکہ قبل تقسیم کے لوٹ مار کرنے سے ممانعت کی گئی تھی جو غلول تھا۔

"ربوٰ" کا قانون کب سے نازل ہوا یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ "لاتاکلوا الربا اضعافاً مضاعفۃً۔ تو بہت پہلے نازل ہوا لیکن اس کو شراب کی طرح تدریجی غیر قطعی حکم قرار دیا جا سکتا ہے لیکن "ربوا" کی جزئی فروع کی حرمت پر عملدرآمد مسلمانوں میں ۷ ہجری سے شروع ہو گیا تھا، موطاء امام مالک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں چاندی کے ایک برتن کی

[1] ترجمان القرآن - یہودیوں کے لئے غنیمت حلال ہو یا نہ ہو، مگر فئے کے حلال ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ قرآن شاہد ہے کہ ایک بار اللہ نے ان کو دینے کا وعدہ کیا تھا ظاہر ہے کہ وہاں کے تمام اموال ان کے لئے فئے ہوں گے۔ مذہ ارشاد ہو کہ ارض موعود کے اعلائے یہودیوں کا قبضہ کس طرح جائز ہوا؟ بیع وشرا یا ہبہ یا صدقہ یا ہدیہ تو نہ تھا۔ [2] ترجمان القرآن یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن میں مطلق اموال الناس کہا گیا ہے۔ خود آپ کے بیان کردہ قاعدہ پر جبکہ اموالہم منہم نہیں کہا گیا تو اس کے معنی یہی ہوں گے وہ یہودی اور غیر یہودی سب سے سود لیا کرتے تھے جس طرح

فروخت کے معاملہ میں فرمایا۔

اربیتما فردّوا — تم دونوں نے ربوا کا معاملہ کیا، پس انہوں نے واپس کر دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ "دارالاسلام" میں یہ قانون ۸ھ سے نافذ ہو چکا تھا لیکن سارے عرب میں کب نافذ ہوا؟ سب کو معلوم ہے کہ عام فتح میں بھی نہیں بلکہ حجۃ الوداع میں ربوا الجاھلیہ کے سقوط کا اعلان حکومت نبویہ کی جانب سے کیا گیا۔ اس سے کیا یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس ملک میں اسلامی اقتدار قائم نہ ہو وہاں ان معاملات کی نوعیت وہ نہیں رہ سکتی جو اسلامی اقتدار کے بعد ہو جاتی ہے[۱] ورنہ کم از کم حضرت عباسؓ جو حجۃ الوداع سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے ان کے ربوا کو قطعاً ۸ھ ہجری سے پہلے ساقط ہو جانا چاہیے تھا۔ نہ کہ حجۃ الوداع میں[۲]۔

تعجب یہ ہے کہ بعض اکابر کو اسی حجۃ الوداع کی روایت سے شبہہ ہوا کہ اگر غیر مسلموں سے ربوا جائز ہوتا تو قبل اسلام کا جو سودی بقایا تھا اس کو شارع علیہ السلام نے کیوں ساقط کیا؟

بلاشبہہ اگر مسئلہ یہ ہوتا کہ نفس عقد ربوا سے سود کا مستحق سود خوار ہو جاتا ہے تو یہ اعتراض

---

[۱] ترجمان القرآن۔ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کسی ملک میں سودی کاروبار کی ممانعت کا عام حکم صرف اسی وقت جاری کریں گے جبکہ وہ اس ملک پر قابض و متصرف ہوں اور اپنے احکام کو غیر مسلموں پر بھی نافذ کرنے کی قوت رکھتے ہوں۔ ہر ذی فہم سمجھ سکتا ہے کہ ملک پر قبضہ ہونے سے پہلے ملک میں قانون کے نفاذ کا حکم دینا محض غیر معقول بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آپ ربا الجاہلیت کے سقوط کا اعلان فرما دیتے جبکہ درحقیقت ربا الجاہلیت لینے اور دینے والے آپ کے تحت حکم آئے ہی نہ ہوں۔ البتہ جو لوگ آپ کے تحت حکم تھے (یعنی مسلمان) ان کو آپ نے سودی لین دین سے منع فرما دیا تھا قبل اس کے کہ ملک عرب میں سودی کاروبار مسدود ہو۔

[۲] ترجمان القرآن۔ حضرت عباس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ واپس چلے گئے تھے اور وہاں وہ سود کا جو کاروبار کر رہے تھے اس کی کوئی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تھی (ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للامام السرخسی ج ۱۴ ص ۵۶) یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور کو کب اس کی اطلاع ہوئی۔ بہرحال جب حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے احکام الٰہی کے تحت ربا کی عام ممانعت کا اعلان فرمایا تو سب کے ساتھ حضرت عباس کے سودی بقایا بھی ساقط کئے گئے۔ یہ واقعہ اس باب میں قطعی الثبوت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کے اس سودی کاروبار کو جائز رکھا تھا۔

ہو سکتا تھا کہ حقوق ثابتہ کے اسقاط کے کیا معنی ہو سکتے ہیں لیکن مسئلہ کی بنیاد استحقاق بواسطۂ الربوٰ پر نہیں ہے اور اسی لیے وہ ربوٰ سود نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اباحت کے قانون پر ہے جب تک ملک اسلامی نہیں ہے اباحت کا حکم باقی رہے گا۔ غیر معصوم معصوم ہو جائے گا۔ پھر اس معصوم کو غیر معصوم کس طرح قرار دیا جاتا[1]۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ نے اسلامی حکومت کی ذمہ داری قبول کر لی، ان کو حکم دیا گیا کہ اب اس کاروبار کو ترک کر دیں، کیونکہ عہد ذمہ کی وجہ سے ان کے اموال معصوم ہو چکے تھے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا صحابہ کے طرز عمل میں بھی ایسا کوئی خصوصی اثر ہے جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے غیر مسلموں سے ربوٰ کا خاص کر کے معاملہ کیا ہو؟ امام محمدؒ نے اس کے جواب میں "سیر کبیر" میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل پیش کیا ہے کہ وہ فتح مکہ سے پیشتر اسی کاروبار کے لیے مدینہ سے مکہ جاتے تھے جو اس وقت تک دار الاسلام نہ تھا[2]۔ اسی طرح ربوٰ تو نہیں، لیکن یہ تو حدیثوں سے ثابت ہے کہ

---

[1] ترجمان القرآن۔ حکم قرآنی کی یہ توجیہ درست نہیں۔ اباحت کے مسئلہ کا اس مسئلہ سے کیا واسطہ۔ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے۔ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ جو شخص خدا کی نصیحت آن کر سود خواری سے باز آ جائے وہ پہلے جو کچھ سود کھا چکا ہے وہ اس کے لئے معاف ہے اب وہ اس سے واپس نہیں دلایا جائے گا۔ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اور اب جو سود تمہارے لوگوں پر چڑھے ہوئے ہیں ان کو تم چھوڑ دو۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ "اگر اس حکم کی پابندی تم نے نہ کی تو اللہ اور رسول سے لڑنے کے لئے تیار رہو"۔ یہ بات سراسر حکمت عملی پر مبنی تھی اور ہر حکومت کسی معاملہ میں احکام امتناعی نافذ کرتے وقت ایسا ہی کرتی ہے۔ قانون کے اعلان سے قبل جو سود لیا اور دیا جا چکا تھا اگر اس کی واپسی کا حکم دیا جاتا تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا جو کبھی ختم ہی نہ ہو سکتا۔ اور اگر اعلان کے بعد پچھلے سودی بقایا وصول کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو قانون بے اثر ہو کر رہ جاتا، اور نہ معلوم کب تک ان بقایا کی تحصیل کا سلسلہ جاری رہتا۔ لہٰذا بیک وقت سود اور اس کے معاملات کا سلسلہ منقطع کر دینا ہی حکمت تشریع کے نقطۂ نظر سے ایک کارگر تدبیر ہو سکتا تھا۔

[2] ترجمان القرآن۔ بالفرض اگر حضرت عباس کا یہ سودی کاروبار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت سے بھی ہو تب بھی یہ حقیقت ہے کہ عام الفتح سے پہلے تک مکہ اور اس کے اطراف کے تمام قبائل مسلمانوں سے برسر جنگ تھے۔ عام الفتح کے بعد اگرچہ مکہ اسلامی حکومت کے ماتحت آ گیا مگر نواحی کے جو مشرکین تھے ان سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ پس یہ مثال زیادہ سے زیادہ اس امر کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کہ حالت جنگ میں دشمن سے عقود فاسدہ پر معاملہ ہو سکتا ہے۔

قمار کا معاملہ ابو بکر صدیقؓ نے کیا اور بدر کے بعد اس کی آمدنی انہوں نے لی۔ یہ کہنا کہ یہ فعل[۵۳] حکم میسر و قمار کے نزول سے پہلے کا ہے، بہت مشکل ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ایران نے روم سے شکست انہی ایام میں کھائی جب کفار قریش کو مسلمانوں سے ہزیمت ہوئی۔ حضرت صدیق کا اس معاملہ میں فریق ثانی امیہ بن خلف تھا جو بدر میں مارا گیا۔ شرط سو اونٹوں کی تھی۔ حضرت صدیق نے اس کے ورثہ پر دعویٰ کیا اور وہ دعویٰ مسموع ہوا۔ سو اونٹ ان کو ملے۔ مدینہ آئے۔ یہ صحیح ہے کہ ٹھیک طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ اونٹ بدر سے کتنے سال بعد وصول کیے گئے لیکن بعید از قیاس ہے کہ غم و غصہ کے بھرے ہوئے قریش نے ٹھیک بدر کے بعد انصاف کو اتنی راہ دی ہو گی، کہ سو اونٹ اصل شرط لگانے والے سے نہیں بلکہ اس کے ورثہ سے حضرت صدیق کو دلوائے ہوں گے۔ بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اگر طے ہوی ہو گی تو صلح حدیبیہ کے بعد طے ہوئی ہو گی اور یہ مسلم ہے کہ خمر (شراب) اور میسر (قمار) کی تحریم کا حکم احد کے قریب قریب نازل ہوا تھا۔ بخاری کی روایتوں سے یہ ثابت ہے۔ پس غالب قرینہ یہی ہے کہ واقعہ حرمت قمار کے نزول کے بعد کا ہے تاریخی طور پر اگر ان واقعات کی جستجو کسی کو مد نظر ہو تو سیرۃ النبی مولانا شبلی مرحوم سے میرے بیان کی توثیق کر سکتے ہیں خصوصاً جن لوگوں کی عربی تک رسائی نہیں ہے بہر حال سیر و آثار نہ بھی ہوں تو کیا اثر سے زیادہ وزن دار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہیں بلکہ قانونی قول نہ ہو گا، جس کے راوی خود امام ابو حنیفہ رح ہیں۔ امام شافعی نے قاضی ابو یوسف کے حوالہ سے بروایت ابو حنیفہ اس

[۵۳] - ترجمان القرآن - "یہ فعل" سے کیا مراد ہے۔ اس فعل کے دو جز ہیں۔ ایک شرط کرنا۔ دوسرے شرط کا مال وصول کرنا۔ پہلا جز تو یقیناً میسر و قمار کی حرمت نازل ہونے سے پہلے کا ہے کیونکہ وہ ہجرت سے چھ سات سال قبل کا واقعہ ہے۔ اور میسر و قمار کی حرمت کے احکام ہجرت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ رہا دوسرا جز یعنی شرط کے اونٹ وصول کرنا تو یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے غالباً تحریم قمار کا حکم نازل ہونے کے بعد ہی کا ہے۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو یہ مال اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہ دی بلکہ صدقہ کرنے کا حکم دیا۔

روایت کو نقل کیا ہے۔

عَن مکحول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ربوٰ بین المسلم والحربی۔ (کتاب الام للشافعی)

مکحول سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان ربو نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ یہ روایت مرسل ہے لیکن کیا اثر صحابہ کے ڈھونڈھنے والوں کے لیے ایک مرسل حدیث میں تسلی نہیں ہے؟ عجیب بات ہے کہ ابن سعد یا اصحابہ سے اگر کوئی اثر نقل کر دیا جائے تو لوگ اس کی وقعت کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ اپنے اعتماد پر ایک مرفوع مرسل صحیح حدیث پیش کرتے ہیں تو اس کو صرف مرسل کہکر ٹالنا چاہتے ہیں۔ اس روایت کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خبر واحد ہے اس سے نص کی تخصیص جائز نہیں۔ لیکن کیا نص کی تائید بھی اس سے نہیں ہو سکتی؟ کیا اس کی وقعت آثار صحابہ کے برابر بھی نہیں؟ غالباً اس تفصیل کے بعد یہ مسئلہ صرف فقہ حنفی کا نہیں رہ جاتا ہے۔ بہرحال میں اور بھی تفصیل کرتا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ ذرا ان لوگوں کا انتظار ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتوی کو اس مسئلہ میں مضمحل بنانا چاہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے فتاویٰ میں ایک سے زائد مقامات پر اس کے متعلق صریح فتویٰ صادر فرما چکے تھے۔ اگر ان کے فتوی میں کلام ہے تو کیا ہندوستان میں کسی کے پاس محدث کی سند محفوظ رہ سکتی ہے؟ جمیعتہ العلماء کے اخبار "الجمیعۃ" میں بھی اس کا فتویٰ شائع ہو چکا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن بنک کے سود کے لینے کا فتوی دیا تھا۔ حرام مال لے کر صدقہ کرنے کی اجازت کون دے سکتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان کے سامنے مسئلہ کی وسعت موجود تھی۔ ورنہ کم از کم میں ان کے اس فتوی کی توجیہ سے عاجز ہوں۔ مولانا عبدالحی صاحب مرحوم نے اپنے فتاوے میں گو ہندوستان کی تصریح نہیں کی لیکن مطلقاً دارالکفر میں انہوں نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اور متعدد بار دیا ہے، بریلی اور بدایوں کے علماء کو بھی

اس سے کم از کم میرے علم میں اختلاف نہیں۔ با ایں ہمہ میں نے اپنے مضمون میں افتار کا رنگ نہیں اختیار کیا ہے۔ بلکہ مسئلہ کی تشریح کرنے کے بعد استفسار کیا ہے علماء سے پوچھا ہے کہ کیا ہندوستان میں اس مسئلہ کے نفاذ کا وقت آگیا ہے۔

مگر سچ پوچھتے ہیں تو ذاتی طور پر اسی شبہہ کی وجہ سے جسے آپ نے نقل فرمایا ہے میں اس کے لکھنے میں متردد تھا۔ پھر کیا کہوں کن مظالم بیجا نے آخر میرے ہاتھ سے صبر کے دامن کو چھڑا لیا مسلمان جلائے گئے۔ لوٹے گئے برباد کیے گئے۔ اور کیے جا رہے ہیں[ل] میں ان حالات کو دیکھ دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ کوئی اور صورت نظر کے سامنے نہ تھی۔ مالی مدافعت، یا مالی حملہ کی صورت سامنے نفی پیش کر دی گئی اور اسی وجہ سے اس کا نام میں نے فَے رکھا کیونکہ شامی میں جزئیہ موجود تھا؛

وَمَایُوخذ منھم بلا حرب ولا قھر کالھدنۃ والصلح فھو لا غنیمۃ ولا فَی حکمہ حکم الفی: صفحہ ۲۲۵ ج ۳

اور ان سے جو کچھ بغیر جنگ اور قہر کے لیا جائے مثلاً مال صلح تو وہ غنیمت ہے اور نہ فے البتہ اس کا حکم فے کا حکم ہے۔

پس جو حکم فئ میں ہو اگر مجازاً اسے فے کہا جائے تو کیا حرج ہے؟ اور اگر اجازت ہو تو کیا اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ "زنا" کے خطرے سے کیا ترک نکاح کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے؟ واقعی مسلمان جو عہد میں باہم لڑ پڑے کیا وہ قانون قتال کا نتیجہ تھا! کیا یہ خطرات بھی واقعی ہیں؟

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ان مولویوں سے ضرور خطرہ ہے جو زوال حکومت کے بعد معمولی معمولی باتوں پر تکفیر کا فتویٰ صادر کر کے فسخ نکاح و ناجوازی اولاد کا حکم لگا رہے ہیں۔ اس صورت میں بالکل ممکن ہے کہ ہر مسلمان دوسرے کے کفر کا فتویٰ لیکر آپس ہی میں اس فعل کو شروع کر دے گا جو اس کے لئے قطعاً موت عذاب جہنم ہے لیکن کاش اسی فتوے کو عملی شکل دینے کے لئے علماء ان مکروہ طریقوں سے باز آئیں۔ ورنہ ہر شخص اپنی نیتوں کا خود ذمہ دار ہے۔

ل۔ ترجمان القرآن۔ آگے چل کر مولانا نے خود ہی اپنے اس ارشاد کا جواب بھی دے دیا ہے۔

لکل امرء ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ تنکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیھا۔

ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔ چنانچہ جس کی ہجرت دنیا کے فائدے کی خاطر ہو، اور جس کی ہجرت کسی عورت کی خاطر ہو، ان میں سے ہر ایک کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

یوں تو نماز بھی دوزخ کی کلید بن سکتی ہے۔ اگر اسی طرح فتوی دے کر لوگ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگیں، تو کیا اس کی وجہ سے قانون جہاد کی حرمت کا فتوی صحیح ہوگا؟

ایک شبہ اور بھی ہے کہ سیونگ بینک میں تو نہیں لیکن عام بینکوں اور کواپریٹو بینکوں کے مالکوں میں بعض بعض مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ بینک کا کاروباری عملہ جس سے لوگ لین دین کرتے ہیں عموماً غیر اقوام کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن مالکوں کی جماعت میں جب مسلمان بھی ہیں تو عمل کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

کاش علماء غور کرتے مسئلہ جوائز السلاطین میں فقہاء نے کیا لکھا ہے۔ بہرحال میری غرض کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک مسئلہ کے متعلق علماء کو چونکانا ہے یا تو وہ انسداد سود کیلئے ایسی آواز بلند کریں جیسی کہ "مانع مسکرات" کی سوسائٹی نے بلند کی ہے یا کم از کم قانونی حدود میں رہ کر اتنا تو کریں جتنا گائے والے کرتے ہیں، شاید حکومت توجہ کرے یا وطن والے کچھ رحم کھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ سود کا تصفیہ قربانی گاؤ کی قربانی سے ہو جائے ورنہ پھر سرمایہ دار مسلمانوں کو کسی ضابطہ نظام کے تحت اس پر آمادہ کیا جائے کہ جو لوگ غیر اقوام کے لوگ غریب مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں وہی وہ دوسروں کے ساتھ کریں

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو جتنی کہ اس نے کی۔

مقصد صرف اس قدر ہے۔ ورنہ جو لوگ محض شکم پروری یا دولتمندی کے لیے اس مسئلہ کے جواز کی فکر میں ہیں، اور اس فکر میں اتنے دیوانے ہو رہے ہیں کہ صحیح غلط جس طرح بن پڑتا ہے قرآن کے ایک منصوص حکم کے توڑنے میں زور لگا رہے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کی بنیاد امارت و دولت پر نہیں بلکہ جس کا فخر "فقر" تھا اسی حقیقت مقدس کبریٰ نے اس کے ستون قائم کیے ہیں بلندی صرف ایمان کے ساتھ ہے

انتم الاعلون - کا وعدہ محض "ان کنتم مومنین" کے ساتھ مشروط ہے، ثروت و دولت والے پہلے بھی وہی تھے جواب ہیں۔ اس وقت بھی قرآن کی یہی ہدایت تھی۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔

پھر ان کے اموال اور اولاد (مردم شماری) تم کو پسندیدہ نہ معلوم ہوں۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے انھیں دکھ پہونچائے اور ان کی جان فرسودہ ہو کر نکلے ایسی حالت میں کہ وہ ناشکرے ہوں :-

اور اب بھی ہم مسلمانوں کے لیے اسی حکم میں قوت ہے۔ ہم امتیوں کو کیا خود ہمارے پیشوا و سردار آقا و امام صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۔

اور اپنی آنکھیں ان کی طرف اونچی نہ کرو جنہیں ہم نے قسم قسم کی تازگی دے رکھی ہے میں اس میں انھیں آزماتا ہوں تیرے رب کی روزی ہی تیرے لیے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

آج جو یورپ کے خداؤں کو بوجھ دیکھ کر چیخ رہے ہیں کہ ہمارے لیے بھی اس قسم کے "الٰہ" ہونے چاہئیں۔ کیا ان کو یہ سنایا نہ جائے کہ تم جس کی امت کے لیے روتے ہو، اس نے ارشاد فرمایا اور قسم کھا کر فرمایا بخاری میں ہے۔

فواللہ ما اخشی علیکم الفقر ولکن اخشی ان تبسط علیکم الدنیا کما بسطت علی من کان قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا وتلھیکم کما الھتھم

پس قسم خدا کی میں فقر یا افلاس سے تمہارے لیے نہیں ڈرتا لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا پھیلائی جائے گی جس طرح تم سے پہلوں پر پھیلائی گئی پھر جس طرح انہوں نے اس میں باہم رشک و تنافس کیا اسی طرح

کہیں تم بھی نہ کرو۔ اور تم بھی غافل نہ ہو جاؤ جس طرح وہ ہوئے۔

تم کہتے ہو کہ مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے، گنیاں نہیں ہیں، عمدہ کوٹ نہیں ہیں، عمدہ کپڑے نہیں ہیں، یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے لیکن مسلمان جن کے ہیں انہوں نے جو فرمایا ہے، دیوانو! اس کی تمہیں خبر بھی نہیں ہے، ارشاد فرمایا بخاری میں ہے۔

تعس عبدالدینار وعبد الدرھم والقطیفۃ والخمیصۃ۔	اشرفیوں اور روپیوں والے جھالردار لباس والے سیاہ عبا والے سب گرے ہلاک ہوئے۔

تم کہتے ہو کہ مفلس قوم تباہ ہوئی جاتی ہے لیکن جس کی قوم ہے وہ فرماتا ہے کہ درہم و دینار کے بندے تباہ ہوئے۔ اب تمہیں بتاؤ کہ ہم مسلمان کس کی سنیں؟ اور سچ ہے کہ جس قوم میں افلاس کا رونا ہے انہوں نے جب سود کھایا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا، تیرہ تیرہ برس کے اندر بائیس بائیس روپیہ کو بائیس لاکھ روپیہ تک بنا کر رہے ان کے افلاس کے مرثیہ خوانوں کی دنیا میں کیا کمی ہے۔ کیا دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا اسی قوم کو پہنچ جاتا ہے جو سود کے میدان میں بازی مارے ہوئے ہے؟ فی کس تین پیسے کن قوموں کی آمدنی ہے۔ اور ان کو تو جانے دو۔ حکومت کے زور سے جو سود کھا رہے ہیں ان کے مزدوروں کا حال "سچ" کی اکثر اشاعتوں میں کیا تمہاری نظروں سے نہیں گزرتا ہے، سچ فرمایا امت کے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

لو کان لابن آدم وادیان من مال لابتغی ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم وفی روایۃ عین آدم الا التراب۔ (بخاری)۔	اگر آدم کے بچوں کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تلاش میں مصروف ہوگا۔ اور آدم کے بچے کا پیٹ (یا آنکھ) مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

پس سے

سر منزل قناعت نتواں ز دست دادن
اے ساربان فرو کش کیں راہ کراں ندارد

مسلمان کے لیے تو وہی نغمہ کافی ہے جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر گایا گیا۔

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔

استدراک

مسئلہ تحلیل ربوا پر ایک قانونی نظر

از ایڈیٹر

ہم کو مولنا مناظر احسن صاحب کی رائے سے جن جن امور میں اختلاف تھا، ان کا اظہار مختصر طور پر حواشی میں کر دیا گیا ہے لیکن جن اصولی مسائل پر مولانا نے اپنے استدلال کی بنا رکھی ہے ان پر روشنی ڈالنے کے لیے محض وہ اشارات کافی نہیں ہیں جو حواشی میں کیے گئے ہیں، لہٰذا یہ مفصل نوٹ علیحدہ لکھا جا رہا ہے۔

مولنا کے استدلال کی بنا حسب ذیل امور پر ہے۔

مولنا کے دلائل کا خلاصہ (۱) ان کا دعویٰ ہے کہ نہ صرف تحریم ربوٰ کا حکم، بلکہ تمام عقود فاسدہ اور ناجائز معاشی وسائل کی ممانعت کے احکام بھی صرف ان معاملات سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہوں بالفاظ دیگر غیر قوموں کے ساتھ جو معاملات پیش آئیں ان میں حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں۔

(۲) ان کے نزدیک شریعت نے تمام ان غیر مسلموں کو مباح الدم والاموال قرار دیا ہے جو ذمی نہ ہوں، لہٰذا ایسے غیر مسلموں کا مال جس طریقہ سے بھی لیا جائے جائز ہے، عام اس سے کہ وہ سود ہو

یا قمار ہو، یا ان کے ہاتھ شراب اور لحم خنزیر اور مردار فروخت کیا جائے یا اور دوسرے وہ طریقے اختیار کیے جائیں جن کو اسلام نے "مسلمانوں کے مقابلہ میں" اختیار کرنے کو حرام ٹھیرایا ہے مسلمان جس طرح بھی ان کا مال لیں گے اس کی حیثیت مال غنیمت یا فے کی ہو گی، اور وہ ان کے لیے حلال وطیب ہے۔

(۳) ان کی رائے میں ہر وہ ملک جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، دار الحرب ہے اور اس کے غیر مسلم باشندے حربی ہیں۔ وہ دار الکفر کو دار الحرب کا، اور کافر غیر ذمی کو حربی کا ہم معنی سمجھتے ہیں، اس لیے اُن کے نزدیک تمام وہ ممالک جن پر غیر اسلامی سلطنتیں قابض ہیں پورے معنوں میں دار الحرب ہیں، اور وہاں علی الدوام وہی احکام مسلمانوں پر جاری رہنے چاہئیں جو دار الحرب کے متعلق کتب فقہیہ میں مذکور ہیں۔

(۴) دار الحرب کی جو تعریف فقہائے متقدمین نے کی ہے وہ مولانا کی رائے میں پوری طرح ہندوستان پر چسپاں ہوتی ہے۔ اور اس ملک کے مسلمانوں کی فقہی پوزیشن ان کی رائے میں "مستامن" کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان اس دار الحرب میں اس حیثیت سے رہتے ہیں کہ انہوں نے یہاں کی حربی سلطنت سے امان لے لی ہے۔

(۵) مستامن کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اُس غیر اسلامی سلطنت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جس سے امان لے کر وہ اس کے ملک میں رہتا ہو۔ لہٰذا مولانا کی رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر انگریزی قانون کی اطاعت تو ایسی فرض ہے کہ اگر ایک سرمو اس سے انحراف کریں گے تو عذاب جہنم کے مستحق ہوں گے لیکن اسلام کے اکثر احکام اور قوانین کی اطاعت سے وہ بالکل آزاد ہیں اس لیے کہ وہ دار الحرب میں مقیم ہیں۔ قتل، غارت گری، چوری، ڈکیتی، رشوت، ٹھگی اور ایسے ہی دوسرے ذرائع سے حربی کفار کو نقصان پہنچانا اور ان کا مال لینا ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صرف اس وجہ سے ناجائز ہے کہ انگریزی قانون اس کو ناجائز کہتا ہے، نہ اس لیے کہ یہ افعال

بجائے خود اسلامی شریعت میں حرام ہیں کیونکہ تمدن اور معیشت اور اخلاق کے بیشتر معاملات میں ہندوستان کے اندر اسلامی شریعت اُس وقت تک منسوخ ہے جب تک یہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے۔ اب شریعت کے قوانین میں سے صرف قانون معاہدہ کا اطلاق یہاں کے مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ اور اسکی رو سے لین دین اور کسب مال کے جو ذرائع انگریزی قانون میں ناجائز ہیں ان کو اختیار کرنا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے شرعاً حرام ہے بخلاف اس کے جن ذرائع کو شریعت نے حرام ٹھیرایا ہے اور انگریزی قانون حلال ٹھیراتا ہے وہ سب کے سب قانوناً بھی حلال ہیں اور شرعاً بھی حلال، نہ دنیا میں ان پر کوئی تعزیر، نہ آخرت میں کوئی مواخذہ۔

دلائل مذکورہ پر مجمل تبصرہ ہمارے نزدیک ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں۔ خود حنفی قانون بھی جس کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا نے یہ تمام تقریر فرمائی ہے۔ ان بیانات کی تائید نہیں کرتا۔ اس مضمون میں مولانا نے اسلامی قانون کی جو تصویر پیش کی ہے وہ صرف غلط ہی نہیں بدنما بھی ہے۔ اس کو دیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہرگز کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی ناواقف شخص اس تصویر کو دیکھے گا تو وہ اسلام کو دنیا کا بدترین مذہب اور مسلمانوں کو ایک نہایت خطرناک قوم سمجھے گا، اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ انگریزی قانون نے ان "مستامنون" کے ہاتھ سے دوسری قوموں کی جان و مال اور آبرو کو بچا رکھا ہے۔ دوسری طرف اگر شریعت کی اسی تعبیر کو قبول کر کے ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں زندگی بسر کرنا شروع کردیں تو شاید پچاس برس کے اندر اُن میں برائے نام بھی اسلام باقی نہ رہے بلکہ اگر خدانخواستہ انگریزی تسلط کے آغاز سے ہندوستان میں انہی اصولوں پر عمل درآمد کیا گیا ہوتا تو آج جو کچھ رہی سہی اسلامیت ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے یہ بھی نہ ہوتی، اور ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان کے مسلمان بالکل مسخ ہو چکے ہوتے۔ البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ ان کی جائدادوں کا ایک حصہ محفوظ رہ جاتا اور ان میں بھی مارواڑیوں اور بنیوں اور سیٹھوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا۔

حاشا وکلا، ہمارا یہ مقصود نہیں کہ مولٰنا نے بالقصد اسلام کی غلط نمایندگی کی ہے ہم یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے قانون اسلامی کو جیسا کچھ سمجھا ہے، غایت درجہ دیانت اور نیک نیتی کے ساتھ ویسا ہی ظاہر فرما دیا ہے مگر ہمیں اعتراض در اصل ان کے مفہوم اور ان کی تعبیر پر ہی ہے گو راقم سطور کو اپنے "عامی" ہونیکا اعتراف ہے اور ایک عالم کے مقابلہ میں شریعت کے کسی مسئلہ پر کلام کرنا خطرے سے خالی نہیں لیکن اس عامی نے قانون اسلامی کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی روشنی میں وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ خاص ان مسائل کی حد تک جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، مولٰنا نے شریعت کے اصول اور احکام کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا ہے۔ اس غلط فہمی کے دو وجوہ قرین قیاس ہیں۔

اوّلاً، ائمہ مجتہدین نے جس زمانہ میں سلطنت اسلامی کے دستوری قانون Constitutional Law) اور بین الاقوامی معاملات کے متعلق کتاب وسنت کی ہدایات اور خود اپنے اجتہاد سے یہ احکام مدون کیے تھے، اس زمانہ میں فقہاء کی حیثیت محض اصحاب درس وتدریس ہی کی نہ تھی بلکہ وہی سلطنت کے قانونی مشیر اور عدالتوں کے صدر نشین بھی تھے رات دن اسلامی سلطنت میں نئے نئے دستوری اور بین الاقوامی مسائل پیش آتے تھے اور ان میں انہی بزرگوں کی طرف رجوع کیا جاتا تھا ہمسایہ قوموں سے جنگ و صلح کے معاملات ہوتے رہتے تھے، اسلامی سلطنتوں کی رعایا اور غیر مسلم سلطنتوں کی رعایا کے درمیان معاملات اور تعلقات کی گوناگوں صورتیں پیش آتی تھیں اور ان سے جو قانونی مسائل پیدا ہوتے تھے ان کا تصفیہ کرنے والے یہی حضرات تھے۔ یہ لوگ اپنے فیصلوں اور تجویزوں میں جو قانونی اصطلاحات وعبارات استعمال کرتے تھے، ان کے مفہومات کا تعین محض لفظی تشریحات پر منحصر نہ تھا، بلکہ ان کی اصلی شرح وہ واقعی حالات تھے جن پر یہ اصطلاحات وعبارات منطبق ہوتی تھیں پس اگر کسی اصطلاح یا عبارت میں کوئی ابہام رہ جاتا یا ایک چیز کے مختلف مدارج پر ایک ہی اصطلاح استعمال کی جاتی اور بظاہر الفاظ میں فرق مدارج پر دلالت کرنے والی کوئی چیز نہ ہوتی، یا ایک وسیع مفہوم پر ایک لفظ بولا جاتا اور صرف موقع ومحل کے لحاظ سے اس کے

مختلف مفہومات میں تمیز ہوتی، تو اس سے عملاً قانون کے انطباق اور استعمال میں کوئی قباحت واقع ہونے کا خطرہ نہ تھا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ کوئی قانون داں شخص کسی حکم کو محض الفاظ کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے بالکل مختلف صورت حال پر چسپاں کر دے گا۔ اس لیے کہ اس وقت اسلامی قانون کی اصطلاحات اور مخصوص قانونی عبارات کی حیثیت رائج الوقت سکوں کی سی تھی علمی دنیا میں ان کا چلن تھا۔ ان کے مفہومات کو سمجھنے اور ٹھیک موقع پر استعمال کرنے، اور ہر ایک کی صحیح حد معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی ہر قانون داں شخص کو شب و روز ان حالات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دوچار ہونا پڑتا تھا جن میں یہ زبان برتی جاتی تھی۔ مگر اب ایک مدت سے وہ صورت حال مفقود ہے۔ دستوری مسائل اور بین الاقوامی معاملات سے بالفعل علماء کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اسلامی سلطنتیں مٹ گئیں اور جو سلطنتیں باقی ہیں ان میں بھی یہ مسائل علمائے شریعت سے متعلق نہیں ہیں۔ علمی دنیا میں اسلامی قانون کی اصطلاحات و عبارات کا چلن بھی مدتوں سے بند ہو چکا ہے۔ اب یہ پرانے تاریخی سکے ہیں جن کی قیمت کا وہ حال نہیں کہ رواج کی وجہ سے بازار میں ہر آدمی کے لیے وہ ایک جانی پہچانی چیز ہو۔ بلکہ ان کی پرانی قدر رائج (Market value) معلوم کرنے کے لیے پرانے ریکارڈوں کی چھان بین کرنا اور زمانۂ حال کے عملی برتاؤ پر قیاس کر کے اس زمانے کے واقعی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک مسائل سیاسی و دستوری کا تعلق ہے فقہ اسلامی کے احکام کو سمجھنا، مسائل نکاح و وراثت وغیرہ کو سمجھنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے خصوصاً جہاں ہماری کتب فقہیہ میں عبارات مبہم رہ گئی ہیں یا اصطلاحات میں توسع پایا جاتا ہے وہاں علماء کے لیے قانون کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی صحیح تعبیر کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اب ان کے صرف الفاظ ہی الفاظ رہ گئے ہیں، کتابوں کے متون بھی لفظی ہیں اور ان کی شروح بھی لفظی۔

دوسری وجہ جس کی طرف خود مولانا نے بھی اشارہ کر دیا ہے، یہ ہے کہ گذشتہ صدی ڈیڑھ صدی سے مسلمانوں پر جو معاشی تباہی مسلط ہوئی ہے، اور جس طرح دیکھتے دیکھتے ان کی کروڑوں اور اربوں روپے

کی جائدادیں کوڑیوں کے مول نکلی ہیں، اور جس طرح مسلمانوں کے بڑے بڑے خوشحال گھرانے روٹیوں کو محتاج ہوئے ہیں، اس کو دیکھ دیکھ کر ہر درد مند مسلمان کی طرح مولنا کا دل بھی دکھا ہے اور انہوں نے غایت درجہ دلسوزی کے ساتھ کوشش کی ہے کہ شریعت میں اس مصیبت کا کوئی حل تلاش کریں۔ اس جذبہ کے اثر سے اکثر مقامات پر ان کا قلم اعتدال اور فقیہانہ احتیاط سے ہٹ گیا ہے (مثلاً ان کا یہ ارشاد کہ ہندوستان میں سود لینا گناہ ہے، یا یہ بیان کہ عقود فاسدہ کی ممانعت کے جملہ احکام صرف مسلمانوں کی باہمی معاملت تک محدود ہیں) جہاں تک مسلمانانِ ہند کے موجودہ روح فرسا حالات کا تعلق ہے کون مسلمان ایسا ہوگا جس کا دل ان کو دیکھ کر نہ دکھتا ہو، اور کون اس کا خواہشمند نہ ہوگا کہ ان مصائب سے مسلمان نجات پائیں۔ اس باب میں ہمارے درمیان ذرہ برابر بھی کوئی اختلاف نہیں۔ مگر میں یہ ماننے سے قطعی انکار کرتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی تباہی کسی حیثیت سے بھی، بالواسطہ یا بلاواسطہ، سود نہ کھانے کی وجہ سے ہے، اور اس حالت کا بدلنا سود کی تحلیل پر موقوف ہے بلکہ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ تحریم سود کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی مسلمانوں کی معاشی ترقی میں مانع ہے۔ جو شخص یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ۔ پر ایمان رکھتا ہو، اور جو اس ارشاد ربانی کو معاش اور معاد دونوں میں ایک اٹل حقیقت سمجھتا ہو اس کو کبھی اس قسم کے شبہات میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔ اگر مولنا غور فرمائیں گے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی معاشی تباہی کا اصلی سبب سود نہ کھانا نہیں ہے، بلکہ سود کھلانا اور ادائے زکوۃ سے جی چرانا، اور اسلامی نظم معیشت کو بالکل معطل کر دینا ہے۔ جن گناہوں کی سزا مسلمانوں کو مل رہی ہے وہ در اصل یہی ہیں۔ اگر وہ ان گناہوں پر قائم رہے اور اس پر سود خواری کا اضافہ اور ہو گیا تو ممکن ہے کہ چند افراد قوم پر خود مولنا کی اپنی زبان میں مالی آماس چڑھ جائے اور اس سے چند سیدھے سادے مسلمان دھوکہ کھا جائیں، لیکن در حقیقت اس سے بحیثیت مجموعی قوم کی معاشی حالت

میں کوئی اصلاح نہ ہوگی اور دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی حالت اور ان کی باہمی الفت و موانست اور ان کے تعاطف و تراحم اور تعاون و تناصر میں شدید انحطاط رونما ہوگا یہاں تک کہ ان کی قومیت مضمحل ہو جائے گی۔

آپ سود کا نام خواہ "پھاؤ" رکھ دیجیے یا مائدۃ من السماء کہکر پکاریے، اس کی حقیقت اور فطری خاصیت میں بال برابر بھی تغیر واقع نہ ہوگا۔ سود اپنی عین فطرت کے لحاظ سے زکوٰۃ کی ضد ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت میں کسی ملک کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک معاشی زندگی میں یہ دونوں یکجا جمع ہو جائیں۔ ایک وہ ذہنیت ہے جس کو روپیہ گننے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بڑھانے، اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں مزا آتا ہے۔ دوسری وہ ذہنیت ہے جس کو قوت بازو سے کمانے اور کما کر کھانے اور کھلانے اور راہ خدا پر لٹا دینے میں مزا آتا ہے۔ کیا کوئی عاقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ دونوں ذہنیتیں ایک ہی دل و دماغ میں جمع ہو سکیں گی؟ کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ جب مسلمان کو سود پر روپیہ لگانے اور یوماً فیوماً اس کے نشو و نما پر نظر رکھنے کا چسکا لگ جائے گا تو اس کے بعد بھی اس کی جیب سے زکوٰۃ و صدقات کے لیے ایک پیسہ نکل سکے گا؟ کیا اس کے بعد بھی کوئی مسلمان مسلمان کو قرضِ حسن دینا گوارا کرے گا؟ کیا اس کے بعد مسلمانوں کی حالت بھی اس قوم کی سی نہ ہو جائے گی جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً اور وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ؟ چند قارون اور شائلاک پیدا کرنے کے لیے پوری قوم آخر کیوں خودکشی کرے؟ اور اس خودکشی کو جائز ثابت کرنے کے لیے خدا اور رسول کے قانون کی غلط تاویل کیوں کی جائے؟ اور امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان جیسے بزرگ کو اس ذمہ داری میں کیوں شریک کیا جائے؟

پھر میں کہتا ہوں کہ دنیا میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو تیرہ سو برس سے سرمایہ داری کی

مخالفت پر قائم ہے اور جس نے عملاً اس فاسد نظام کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس قوم کو جو چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ داری کی عداوت پر قائم رکھنے والی، اور نظام سرمایہ داری میں جذب ہونے سے بچانے والی ہے وہ زکوٰۃ کی فرضیت اور سود کی تحریم ہی ہے۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ اور نہلسٹ سب سرمایہ دار سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، مگر جب تک یہ دو زبردست رکاوٹیں قائم ہیں، مسلمان کبھی اس سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وہ قومیں سرمایہ داری میں جذب ہو گئیں جن کے مذہب نے سود سے منع کیا تھا، مگر مسلمان تیرہ صدیوں سے اس کے مقابلہ میں جما ہوا ہے۔ اب کہ خود دنیا والوں میں بھی بصارت پیدا ہو رہی ہے اور وہ سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے فوج در فوج جمع ہو رہے ہیں، یہ کیسی بدبختی ہو گی کہ مسلمان خود میدان مقابلہ سے ہٹ جائے اور اپنے ہاتھوں اپنے قلعہ کے مستحکم برجوں کو مسمار کر کے سرمایہ داری کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانے لگے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم اصل قانونی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کیا عقود فاسدہ صرف مسلمانوں کے درمیان ممنوع ہیں؟

مولانا کے پہلے دعوے کی بنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کسب مال کے ناجائز ذرائع سے روکا گیا ہے وہاں "بَيْنَكُمْ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں عقود فاسدہ پر معاملات نہ کیا کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (النساء ۵) اب یہ ظاہر ہے کہ سود بھی کسب مال کے ناجائز طریقوں میں سے ایک طریقہ ہی ہے۔ لہٰذا قرآن میں أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ جو فرمایا گیا ہے، یہ بھی اگرچہ ظاہر الفاظ کے لحاظ سے عام حکم ہے، مگر جس اصل کی فرع ہے اس کے ساتھ بالتبع اس کو بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک ہی محدود سمجھنا چاہیے۔ اس کی مزید تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو مکحول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ لا ربوٰ بین المسلم والحربی۔ یعنی مسلمان اور حربی کا فر کے

درمیان تفاضل کے ساتھ جو لین دین ہو اس پر لفظ "سود" کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔ بالفاظ دیگر لا ربوا کے معنی یہ ہیں کہ غیر ذمی کافر سے جو سود لیا جائے وہ سود ہی نہیں، پھر وہ حرام کیسے ہوا؟

یہ مولانا کے استدلال کا خلاصہ ہے۔ اس میں پہلی اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ قرآن کے مقاصد سے قطع نظر کر کے صرف ظاہر الفاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنی ہدایتیں دیتا ہے ان میں صرف اہل ایمان کو مخاطب کرتا ہے، اور ان سے کہتا ہے کہ تم آپس میں ایسا کیا کرو یا نہ کیا کرو۔ اس طرز بیان میں کچھ دوسری حکمتیں ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اس قسم کے انداز بیان میں اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنے احکام اللہ تعالیٰ نے دیے ہیں، ان کو فقہائے امت میں سے کسی نے بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک محدود قرار نہیں دیا ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان جو افعال حرام ہیں مسلمان اور کافر کے درمیان وہی حلال یا مستحب ہیں۔ اگر ایسا ہو تو درحقیقت اسلامی اخلاقیات اور قانون مدنی کی جڑ ہی کٹ جائے۔ مثلاً ارشاد باری ہے وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ (النحل: ۱۳) کیا اس کا یہ مطلب لیا جائیگا کہ مسلمان صرف مسلمان سے جھوٹی قسم نہ کھائے، رہے غیر مسلم تو ان سے دروغ حلفی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں؟ فرمان الٰہی ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (انفال: ۳) کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان صرف ان امانتوں کی حفاظت کریں جو مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہوں؟ باقی رہی کافر کی امانت تو اس میں بے تکلف خیانت کر ڈالی جائے؟ پھر یہ جو فرمایا کہ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (بقرہ: ۳۹) تو کیا اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ مسلمان کے بجائے کوئی کافر اگر کسی مسلمان پر بھروسہ کر کے بغیر لکھا پڑھی کیے اپنا کچھ مال اس کے پاس رکھوا دے تو وہ اسے "بیادا" سمجھ کر اس کو کھا سکتا ہے؟ پھر یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ، اور وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا اور وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ، اور وَاَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۳۹) تو کیا یہ سب احکام صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات ہی کے لیے ہیں؟ کیا کافر کے لیے شہادت سے انکار کرنا یا سچی شہادت چھپا کر جھوٹی شہادت دینا یا دستاویز کے غیرمسلم کاتب یا گواہ کو خوف زدہ کرنا یہ سب جائز افعال ہیں؟ اس کے بعد جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (النور: ۲) تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ غیر قوموں کے اندر فحش اور بدکاری پھیلانا مسلمان کے لیے جائز ہے؟ اور یہ جو فرمان ہوا کہ إِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (النور: ۳) تو کیا اس کی یہی تاویل کی جائے گی کہ کفار کی عورتوں پر جھوٹی تہمتیں دل کھول کر لگاؤ؟ اور یہ جو ارشاد ہوا کہ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النور: ۴) تو کیا اس کو یہ معنی پہنائے جائیں گے کہ کافر عورتوں کو حرام کاری پر مجبور کرنا اور اُن کی خرچی کھانا جائز ہے؟ کیا اس طرح کی تاویل کرکے کسی مسلمان کے لیے یہ حلال ہو گا کہ پیرس میں سرکاری لائسنس لے کر ایک قحبہ خانہ کھول دے؟ پھر یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات: ۲) تو کیا اس کی یہ تاویل ہو گی کہ صرف مسلمان کی غیبت ناجائز ہے؟ باقی رہا کافر تو اس کی غیبت کرنے میں کوئی برائی نہیں؟ اگر اسی اصول پر قرآن اور سنت کے احکام کی تاویل کی جائے اور مسلمان اسی کا اتباع شروع کر دیں تو اندازہ فرمائیے کہ یہ قوم کیا سے کیا بن کر رہے گی؟

بالفرض اگر بلادلیل یہ مان بھی لیا جائے کہ صرف لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

ہی کا حکم مسلمانوں کے باہمی معاملات کے لیے مخصوص ہے اور یہ قاعدہ دوسرے احکام میں جاری نہ ہوگا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ذمی کافروں کو سودی لین دین سے کیوں روکا گیا؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم جماعتوں سے اس قسم کے معاہدات کیوں کیے کہ وہ سودی کاروبار چھوڑ دیں ورنہ معاہدہ کالعدم ہو جائیگا؟ اور کتب فقہیہ میں یہ تصریح کیوں ہے کہ اگر کوئی حربی کافر دارالاسلام میں امان لے کر آئے تو اس سے بھی سود پر معاملہ کرنا حرام ہے؟۔

یہی حدیث لا ربوٰ بین المسلم والحربی، تو اولاً اس میں لفظ حربی سے مراد محض غیر ذمی کافر نہیں بلکہ برسر جنگ قوم کا فرد ہے جیسا کہ خود فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے آگے چل کر ثابت کیا جائے گا۔

ثانیاً لا ربوٰ کا یہ مفہوم نہیں کہ حربی کافر سے جو سود لیا جائے گا وہ سود ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گو وہ صورۃً وحقیقۃً سود ہی ہے، لیکن اس کو قانون میں حرمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور اس کی حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ گویا وہ سود ہی نہیں ہے۔ ورنہ کسی سود کو یہ کہنا کہ وہ سود ہے ہی نہیں، اس قدر مہمل اور بے معنی بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسے منسوب کرنے کو میں گناہ سمجھتا ہوں۔ یہ بالکل ایک معقول بات ہے کہ کسی خاص حالت میں سود کو تعزیر اور حرمت سے مستثنیٰ کر دیا جائے جس طرح خود قرآن نے اضطرار کی حالت میں مردار اور سور اور ایسی ہی دوسری حرام چیزیں کھا لینے کو مستثنیٰ کیا ہے لیکن یہ ایک نہایت غیر معقول بات ہے کہ سود کی حقیقت جوں کی توں باقی ہو، اور ہم ایک جگہ اس کو ربوٰ کہیں اور دوسری جگہ سرے سے اس کے ربوٰ ہونے ہی سے انکار کر دیں۔ اس طرح تو دنیا کے ہر فعل حرام کو محض تغیر اسم سے حلال کیا جا سکتا ہے جس خیانت کو جی چاہے کہہ دیجیے کہ یہ خیانت ہی نہیں جس جھوٹ کو جائز کرنا ہو کہہ دیجیے کہ اس پر لفظ جھوٹ کا اطلاق ہی نہیں ہوتا جس غیبت اور فحش اور حرام خوری کی طرف طبیعت مائل ہو اس کا نام بدل کر سمجھ لیجیے کہ اس کی حقیقت بھی بدل گئی۔ سرکار رسالتمآب کا مرتبہ اس سے

بہت بلند تھا کہ آپ اس قسم کے لفظی حیلے اپنی امت کو سکھاتے۔

ثالثاً اس حدیث میں جو حکم بیان ہوا ہے اس کی حیثیت محض ایک رخصت اور رعایت کی ہے، نہ یہ کہ اس کو مسلمانوں کا عام دستور العمل بنانا مقصود ہو۔ میں اس بحث کو بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے کیونکہ حدیثوں کے ردّ و قبول میں فقہیہ کے اصول محدث کے اصول سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ امام اعظم اور امام محمد جیسے ائمۂ مجتہدین نے جس حدیث کو قابل استناد سمجھا ہو اس کو بالکل ناقابل اعتبار قرار دینا درست نہیں، مگر اس مختصر اور غیر واضح اور مختلف فیہ[1] خبرِ واحد کو اتنا پھیلانا بھی درست نہیں کہ قرآن اور حدیث اور آثار صحابہ کی متفقہ شہادت ایک طرف ہو اور دوسری طرف صرف یہ حدیث ہو، اور پھر بجائے اس کے کہ اس ایک حدیث کی تاویل اُن سب کے مطابق کی جاتی، اُن سب کو اس ایک حدیث پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن اور تمام احادیث صحیحہ میں مطلقاً ربوٰ کو حرام کہا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان نہ آپس میں اس کا لین دین کرسکتے ہیں نہ غیر قوموں کے ساتھ ایسا کاروبار کرنا ان کے لیے جائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے جو معاہدہ کیا تھا اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان نہ صرف خود سودی لین دین سے پرہیز کریں گے بلکہ جن جن غیر مسلموں پر ان کا بس چلیگا ان کو بھی بجبر اس فعل سے روک دیں گے۔ تحریم ربوٰ کے بعد ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت سے کسی مسلمان نے کسی ذمی یا غیر ذمی کافر کے ساتھ سودی معاملہ کیا ہو۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ بات صرف سود ہی پر موقوف نہیں، عقود فاسدہ میں سے کوئی ایک عقد فاسد بھی ایسا نہیں جس کی تحریم کا حکم نازل ہوجانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ و نے اس کے انعقاد کی کسی مسلمان کو اجازت دی ہو۔ نظری اور اصولی اہل حرب تو درکنار، جو لوگ عملاً برسر جنگ تھے، انہوں نے عین معرکۂ جنگ میں

---

[1] یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ امام ابو یوسف، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اکثر ارباب حدیث نے اس روایت کو رد کردیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عقد فاسد پر معاملہ کرنا چاہا اور کافی رقم پیش کی، مگر آپ نے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ؑ ایک طرف آیت قرآنی، اور نبی کے متعدد صریح و صحیح اقوال اور عہد نبوی کا ثابت شدہ عمل در آمد ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف سود بلکہ تمام عقود فاسدہ مطلقاً ناجائز ہیں اور اس میں مسلم و غیر مسلم یا حربی و ذمی کا کوئی امتیاز نہیں۔ دوسری طرف صرف ایک مرسل حدیث ہے جو ان سب کے خلاف حربی اور مسلم کے درمیان صرف سود کو حلال ثابت کر رہی ہے۔ آپ نے اس حدیث کو اتنی اہمیت دی کہ اس کی بنیاد پر نہ صرف سود کو بلکہ تمام عقود فاسدہ کو تمام غیر ذمی کفار کے ساتھ عمومیت کے ساتھ حلال کر ڈالا۔ اگر ہم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سے صرف اتنی اجازت نکالتے ہیں کہ جنگ کی اضطراری حالتوں میں اگر کوئی مسلمان دشمن سے سود لے یا کسی اور عقد فاسد پر معاملہ کرلے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔

یہ محض ایک رخصت ہے اور ایسی رخصت ہے جس سے اولوالعزم مسلمانوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسلامی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کسی حال میں بھی حرام کی کمائی لینے پر آمادہ نہ ہو خصوصاً کفار اور دشمنوں کے مقابلہ میں تو اس کو اپنے قومی اخلاق کی بلندی اور بھی زیادہ شان کے ساتھ ظاہر کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان کی لڑائی در اصل تیر و تفنگ کی نہیں اصول اور اخلاق کی ہے۔ اس کا مقصد زر و زمین

ؑ یہ واقعہ غزوۂ خندق کا ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس اس کے راوی ہیں۔ مشرکین میں سے ایک شخص کی لاش خندق میں گر پڑی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو روپیہ دے کر وہ لاش ان سے خریدنی چاہی۔ مسلمانوں نے حضور سے دریافت کیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ (کتاب الخراج للامام ابی یوسف۔ طبع میریہ۔ ص ۱۲۳) اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنگ کے موقع پر مسلمان کو دشمنوں سے عقود فاسدہ پر معاملہ کرنے کی اجازت دی بھی گئی ہے تو وہ کراہت سے خالی نہیں اور یہ بات مسلمان کے شایان شان نہیں کہ شدید حالت اضطرار کے بغیر اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی بات پر وہ واقعہ بھی دلالت کرتا ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے مکہ میں تحریم قمار سے پہلے مشرکین سے ایک شرط کی تھی۔ پھر شرط کا روپیہ انہوں نے اس زمانہ میں ان سے وصول کیا جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حالت جنگ قائم تھی اور صرف عارضی التوائے جنگ ہو اتھا لیکن حضور نے اس کو بھی حلال و طیب نہیں ٹھیرایا اور صدیق اکبر کو حکم دیا کہ اسے صدقہ کر دو۔

حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ وہ دنیا میں اپنے اصول پھیلانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے مکارم اخلاق ہی کو کھو دیا اور خود ہی ان اصولوں کو قربان کر دیا جن کو پھیلانے کے لیے وہ کھڑا ہوا ہے، تو پھر دوسری قوموں پر اس کی فوقیت ہی کیا باقی رہی؟ کس چیز کی بنا پر اس کو دوسروں پر فتح حاصل ہوگی اور کس طاقت سے، وہ دلوں اور روحوں کو مسخر کر سکے گا؟

دار الحرب کی بحث | اب ہمیں دوسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ دار الحرب اور دار الاسلام کے فرق کی بنیاد پر سود اور تمام عقود فاسدہ کے احکام میں کیا فرق واقع ہوتا ہے، اور اس بیان کی کیا اصلیت ہے کہ تمام غیر ذمی کافر مباح الدم والاموال ہیں اس لیے ہر ممکن طریقہ سے ان کا مال لے لینا جائز ہے؟ اور اس تجویز کے لیے شریعت میں کیا گنجائش ہے کہ جس ملک پر کسی معنی میں اصطلاح دار الحرب کا اطلاق ہوتا ہو وہاں کے باشندوں پر دائماً وہ تمام احکام جاری ہونے چاہئیں جو دار الحرب سے تعلق رکھتے ہوں؟

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ شریعت یعنی قانون اسلامی کے تین شعبے ہیں۔ ایک اعتقادی قانون جو علی الاطلاق تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دستوری قانون جس کا تعلق صرف سلطنت اسلامی سے ہے۔ تیسرا بین الاقوامی قانون یا صحیح الفاظ میں تعلقات خارجیہ کا قانون جو مسلمانوں اور غیر قوموں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے۔ ہماری کتب فقہ میں ان قوانین کو الگ الگ مرتب نہیں کیا گیا ہے اور نہ ان کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے، لیکن قرآن و حدیث میں ایسے واضح اشارات کر دیے گئے ہیں جن سے قدرتی طور پر اسلامی قوانین کا ارتقاء تین الگ الگ راستوں پر ہوا ہے۔ بخصوصیت کے ساتھ حنفیہ اعظم کی قانونی بصیرت اور فقیہانہ دقیقہ سنجی نے سب سے بڑھ کر ان اشارات کو سمجھا اور ان کی بنا پر قانون کے ان تینوں شعبوں کی حدود میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کیا، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس امتیاز کو ملحوظ رکھا۔ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فقہائے اسلام میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کا ہم سر نظر نہیں آتا حتیٰ کہ امام ابویوسف جیسے بالغ النظر فقیہ کی رسائی بھی اس مقام تک

نہ ہو سکی۔ امام اعظم کے کمال کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ۱۲ سو سال پہلے انہوں نے قرآن اور سنت سے استنباط کرکے دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے جو احکام مدون کیے تھے، آج تک دنیا کے قانونی افکار کا ارتقا ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دراصل یہ ارتقا، ہوا ہی ان خطوط پر ہے جو ۱۲ صدی قبل کوفہ کے ایک پارچہ فروش نے کھینچ دیے تھے۔ فقہ حنفی کی بہ نسبت جدید زمانے کے قوانین میں نظماً جو ترقی نظر آتی ہے وہ کسی حد تک تمدنی احوال کے تغیر کا، اور زیادہ تر بین الاقوامی معاہدات کا نتیجہ ہے، تاہم اصولی حیثیت سے جدید زمانہ کے قوانین بڑی حد تک حنفی فقہ کا چربہ ہیں، اور ان کے مطالعہ سے حنفی فقہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اعتقادی قانون اعتقادی قانون کے لحاظ سے دنیا دو ملتوں پر منقسم ہے۔ اسلام اور کفر۔ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور تمام کفار دوسری قوم۔ اسلام کو ماننے والے سب کے سب اسلامی قومیت کے افراد ہیں اور اخوت دینی کی بنا پر سب کو ایک دوسرے پر حقوق حاصل ہیں۔ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ۔ (توبہ : ۲) مسلمان کی جان اس کا مال اس کی عزت ہر چیز مسلمان کے لیے حرام ہے۔ ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام (حجۃ الوداع) اسلام کے جملہ احکام کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں جا ہو۔ جو کچھ فرض کیا گیا ہے وہ سب کے لیے فرض، جو کچھ حلال کیا گیا ہے سب کے لیے حلال ہے اور جو کچھ حرام ٹھیرایا گیا ہے سب کے لیے حرام ہے کیونکہ جملہ احکام کے مخاطب الَّذِينَ آمَنُوا ہیں، کسی حال اور مقام کی قید اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس قومیت کے مقابلہ میں کفر ایک ملت ہے جس سے ہمارا اختلاف اصول اور اعتقاد اور قومیت کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر اصلاً ہمارے اور ان کے درمیان جنگ قائم ہے۔ الا یہ کہ اس پر صلح یا معاہدہ یا ذمہ کی کوئی حالت عارض ہو جائے۔ پس اسلام اور کفر، اور مسلم اور کافر کے درمیان صلح اصل نہیں ہے بلکہ جنگ اصل ہے اور صلح اس پر عارض ہوتی ہے۔ مگر یہ جنگ بالفعل نہیں، بالقوۃ

ہے عملی نہیں نظری اور اصولی ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ جب تک ہماری اور ان کی قومیت الگ ہے، ہمارے اور ان کے اصول ایک دوسرے سے متصادم ہیں، ہم میں اور ان میں حقیقی و دائمی صلح اور دوستی نہیں ہو سکتی۔ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ : ۱)۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر حدیث میں تمام و کمال بیان فرما دیا ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ وان یستقبلوا قبلتنا وان یاکلوا ذبیحتنا وان یصلوا صلوتنا فاذا فعلوا ذالک حرمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقھا لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین (ابو داؤد۔ باب علی ما یقاتل المشرکین)

مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ہمارے اوپر ان کے خون اور ان کے اموال حرام ہو جائیں گے بجز اس کے کہ کسی حق کے بدلے میں ان کو لیا جائے۔ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور ان پر فرائض وہی عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس اعتقادی قانون کی رو سے اسلام اور کفر کے درمیان ابدی جنگ ہے مگر یہ جنگ محض نظری (Theoretical) ہے۔ ہر کافر حربی (Enemy) ہے مگر اس معنی میں کہ جب تک ہماری اور اس کی قومیت الگ ہے ہمارے اور اس کے درمیان بنائے نزاع قائم ہے۔ ہر دار الکفر دار الحرب ہے مگر اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جب تک وہ دار الکفر ہے محل حرب ہے یا بالفاظ دیگر حربیت کا کلی ارتفاع صرف اختلاف قومیت ہی کے مٹ جانے سے ہو سکتا ہے۔ اس قانون نے محض ایک نظریہ اور قاعدۂ اصلیہ

واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے جس پر ان کی حکمت عملی کی بنا قائم ہے۔ باقی رہے حقوق و واجبات اور جنگ و صلح کے عملی مسائل تو ان کا اس قانون سے کوئی تعلق نہیں وہ دستوری اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔

دستوری قانون | دستوری قانون کی رو سے دنیا کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک دارالاسلام۔ دوسرے دارالکفر۔ دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کرسکیں۔ اس کے مقابلہ میں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اسلامی قانون نافذ نہیں وہ دارالکفر ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تمام وہ ممالک جن میں انگریزی حکومت ہے انگریزی علاقہ کہلائیں گے، اور جو علاقے ان حدود سے باہر ہوں گے ان کو علاقہ غیر کہا جائے گا۔ اسلامی حکومت اسلام کے احکام کو صرف ان لوگوں پر نافذ کرسکتی ہے جو اس کے اپنے حدودِ عمل (Jurisdiction) میں رہتے ہوں۔ اسی طرح وہ صرف انہی اموال اور اعراض اور نفوس کی حفاظت کرسکتی ہے جو اس کے اپنے حدود اختیار یا علاقہ مقبوضہ (Territory) میں واقع ہوں۔ اِن حدود کے باہر کسی چیز کی حفاظت کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے ہر وہ جان اور مال اور عزت معصوم (Protected) ہے جو دارالاسلام میں اسلامی حکومت کی حفاظت کے اندر واقع ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی اور ہر وہ جان اور مال اور عزت غیر معصوم (Unprotected) ہے جو دارالکفر میں ہو اور جس کی محافظ اسلامی حکومت نہ ہو، عام اس سے کہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ غیر معصوم ہونے کا مآل صرف اس قدر ہے کہ اگر اس جان و مال یا عزت پر کسی قسم کا حملہ کیا جائے تو اسلامی حکومت اس پر کوئی مواخذہ نہ کرے گی؛ کیونکہ یہ فعل اس کے حدودِ عمل سے باہر واقع ہوا ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ خدا کے نزدیک وہ فعل گناہ ہو یا نہ ہو اور خدا کے ہاں اس پر مواخذہ ہو یا نہ ہو۔ پس کسی چیز کا غیر معصوم ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ

وہ مباح بھی ہے نہ اس کی عدم عصمت کو اس معنی میں لیا جا سکتا ہے کہ اُسے نقصان پہونچانا یا اس پر قبضہ کر لینا عند اللہ بھی جائز اور حلال ہے۔ اسی طرح دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے اگر کسی ایسے فعل کو جائز ٹھیرایا جائے جس کا ارتکاب دار الکفر میں کیا گیا ہو تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہوگا کہ اسلامی حکومت کو اس سے کوئی تعرض نہیں۔ وہ اس پر کوئی سزا نہ دے گی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس فعل حرام پر خدا کے ہاں بھی کوئی گرفت نہ ہوگی۔

یہاں اعتقادی قانون اور دستوری قانون کے حدود الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اعتقادی قانون جس مسلمان کو بھائی کہتا ہے اور جس کی جان و مال کو حرام ٹھیراتا ہے وہ دستوری قانون کی نگاہ میں غیر معصوم ہے اس لیے کہ وہ سلطنت اسلامی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اور جس کافر کو اعتقادی قانون دشمن قرار دیتا ہے دستوری قانون اسے معصوم ٹھیراتا ہے صرف اس بنا پر کہ وہ اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آگیا ہے۔ جس فعل کو اعتقادی قانون سخت گناہ اور حرام ٹھیراتا ہے، دستوری قانون اس کی کوئی گرفت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے جورسڈکشن سے باہر ہوتا ہے۔ دونوں میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ اعتقادی قانون کا تعلق آخرت سے ہے اور دستوری قانون کا تعلق صرف دنیا اور اس کے معاملات سے لیکن امام ابو حنیفہ کے سوا تمام فقہا نے کم و بیش ان دونوں میں خلط ملط کیا ہے اور ان کے حدود میں پوری طرح تمیز نہیں کر سکے ہیں۔

چند مثالوں سے ہم اس پیچیدہ مسئلہ کی توضیح کریں گے۔

۱۔ فرض کیجیے کہ ایک مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں جاتا ہے اور وہاں سے کچھ مال چرا لاتا ہے۔ یہ فعل اعتقادی قانون اور بین الاقوامی قانون کی رو سے حرام ہے لیکن دستوری قانون اس شخص کو اس مال کا جائز مالک قرار دیتا ہے اور اس سے کوئی بازپرس نہیں کرتا۔ (ہدایہ۔ باب المستامن)۔

۲۔ فرض کیجیے کہ دار الاسلام کی رعایا کا ایک شخص دار الحرب میں قید تھا۔ وہ وہاں قیدے

چھوٹ گیا یا چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ وہاں خواہ چوری کرے خواہ قتل کرے، سب کچھ دستوری قانون کی رو سے اس کے لیے مباح ہے (بحر الرائق ج ۵ صفحہ ۱۰۱)۔

(۳) فرض کیجیے کہ ایک شخص دار الحرب میں مسلمان ہوا اور وہاں سے ہجرت کرکے دار الاسلام میں نہیں آیا۔ اعتقادی قانون کی رو سے وہ مسلمانوں کا بھائی ہو چکا ہے۔ اس کا خون اور مال حرام ہو چکا ہے۔ مگر دستوری قانون کی رو سے وہ چونکہ اسلامی سلطنت کے حدود کشش سے باہر ہے اس لیے اس کی کوئی چیز معصوم نہیں۔ اس کی حیثیت وہی ہوگی جو غیر سلطنت کی رعایا کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان دار الاسلام کے حدود سے باہر اس کو قتل کر دے تو اسلامی عدالت نہ اس پر قصاص لے گی نہ خوں بہا دلوائے گی، بطور خود وہ کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اس سے سود لے یا اس کے مال پر کسی دوسرے ناجائز طریقہ سے قبضہ کرے تو دستوری قانون کی رو سے یہ جائز ہے کیونکہ اس کا مال غیر معصوم ہے۔ اس باب میں فقہا کی تصریحات نہایت معنی خیز ہیں۔

واذا اسلم رجل من اهل الحرب فقتله رجل من المسلمين قبل ان يخرج الى دار الاسلام خطأً فعليه الكفارة ولا دية عليه۔ وفي الاملاء عن ابي حنيفة رحمه الله انه لا كفارة عليه ايضا لان وجوبها باعتبار تقوم الدم لا باعتبار حرمة القتل..... وتقوم الدم يكون بالاحراز بدار الاسلام (شرح السير الكبير مطبوعہ دائرة المعارف۔ ج ۱ صفحہ ۵۹)	اگر اہل حرب میں سے کوئی شخص مسلمان ہو چکا ہو اور قبل اس کے کہ وہ ہجرت کرکے دار الاسلام میں آئے کسی مسلمان نے اسے بلا ارادہ قتل کر دیا تو اس پر کفارہ ہے مگر خوں بہا واجب نہیں۔ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے املاء میں یہ مسئلہ منقول ہے کہ اس پر کفارہ بھی نہیں ہے کیونکہ کفارہ کا وجوب خون کے باقیمت ہو جانے کے اعتبار سے ہے نہ کہ حرمت قتل کے اعتبار سے ..... اور خون صرف اس وقت باقیمت ہوتا ہے جب کہ وہ دار الاسلام میں آ چکا ہو۔

ولما ثبت بما قدمنا انه لاقيمة لدم المقيم في دار الحرب بعد اسلامه قبل الهجرة الينا ..... اجروه اصحابنا مجرى الحربي في اسقاط الضمان عن متلف ماله .... وان يكون ماله كمال الحربي من هذا الوجه ولذلك اجاز ابوحنيفة مبايعته على سبيل ما يجوز مبايعة الحربي من بيع الدرهم بالدرهمين في دار الحرب (احكام القرآن للجصاص الحنفي - ج ۲ - ص ۲۹۷)

اور جب ہماری پچھلی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہجرت نہ کرے اور دار الحرب میں مقیم رہے اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں ...... تو اسی بنا پر ہمارے اصحاب (حنفیہ) نے ایسے مسلمان کی حیثیت حربی ہی کی قرار دی ہے یعنی اس کے مال کو تلف کرنے والے پر بھی کوئی ضمان نہیں ...... اس حیثیت سے اس کا مال گویا حربی کا مال ہے اور اس بنا پر ابو حنیفہ نے اس کے ساتھ بھی اسی طرح خرید و فروخت کرنا جائز ٹھیرایا ہے جس طرح حربی کے ساتھ جائز ہے یعنی دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا۔

وقال الحسن بن صالح اذا اسلم الحربي فاقام ببلادهم وهو يقدر على الخروج فليس بمسلم يحكم فيه بما يحكم على اهل الحرب في ماله ونفسه (احكام القرآن)

حسن بن صالح کا قول ہے کہ جب حربی مسلمان ہونے کے بعد اہل حرب ہی کے علاقہ میں رہا درانحالیکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا تھا تو اس کی حیثیت مسلمان کی نہیں اس کی جان و مال کا وہی حکم ہے جو اہل حرب کی جان و مال کا ہے۔

واذا اسلم الحربي في دار الحرب فقتله مسلم عمداً او خطأً وله ورثة مسلمون هناك فلا شئ عليه الا الكفارة في الخطأ (ہدایہ کتاب السیر)

جب کوئی حربی دار الحرب میں مسلمان ہو چکا ہو اور کوئی مسلمان اسے عمداً یا خطأً قتل کر دے اور اس کے کوئی مسلمان ورثہ بھی دار الحرب میں موجود ہوں تو اس پر قصاص یا دیت نہیں ہے خطا کی صورت میں محض کفارہ ادا کرنے

وحکم من اسلم فی دار الحرب ولم یھاجر کالحربی عند ابی حنیفۃ لان مالہ غیر معصوم عندہ (بحر الرائق ج ۵ ۔ ص۱۰۱)

اور جو شخص دار الحرب میں مسلمان ہو اور ہجرت نہ کرے اس کی حیثیت ابو حنیفہ کے نزدیک حربی کی ہے کیونکہ اس کا مال ان کی رائے میں غیر معصوم ہے ۔

۴ - فرض کرو کہ ایک مسلمان امان لیکر دار الحرب میں گیا اور وہاں اس نے کسی حربی سے قرض لیا یا اس کا مال غصب کر لیا ۔ پھر وہ دار الاسلام واپس آگیا اور وہ حربی بھی دار الاسلام میں امان لے کر آیا یہاں وہ حربی مستامن اس قرض یا اس مال مغصوبہ کے لیے دار الاسلام کی عدالت میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ اسلامی عدالت اس کو ایک پیسہ واپس نہ دلائیگی ۔ اسی طرح اگر دار الحرب میں حربی نے مسلمان کا قرض مار لیا ہو یا اس کا مال غصب کر لیا ہو، پھر وہ حربی امان لیکر دار الاسلام میں آئے تب بھی اسلامی عدالت اس حربی کے خلاف اس مسلمان کی کوئی دادرسی نہ کرے گی ۔ (الجامع الصغیر للامام محمد علی حاشی کتاب الخراج للامام ابی یوسف ۔ ص۵۱)

۵ - اگر باپ دار الاسلام میں ہو اور اس کی نابالغ اولاد دار الحرب میں ہو تو اس اولاد پر سے باپ کی ولایت ساقط ہو جائے گی ۔ اسی طرح اگر مال کا مالک دار الاسلام میں ہو اور مال دار الحرب میں ہو تو مالک کی جان معصوم ہو گی مگر مال معصوم نہ ہو گا ۔ (فتح القدیر ج ۴ ص۳۵۵)

۶ - دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان امان لے کر دار الحرب میں چلے گئے اور وہاں ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا ۔ اگر قاتل دار الاسلام میں واپس آئے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا ۔ صاحب ہدایہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے وہ قابل غور ہے :

وانما لا یجب القصاص لانہ لا یمکن استیفاءہ الا بمنعۃ ولا منعۃ دون الامام وجماعۃ المسلمین ولم یوجد

اس پر قصاص اس لیے واجب نہیں کہ قصاص بغیر منعت (Protection) کے واجب نہیں آتا اور منعت بغیر امام اور جماعت مسلمین کے نہیں ہوتی

ذالک فی دار الحرب (ھدایہ کتاب السیر) اور یہ چیز دار الحرب میں موجود نہیں ہے

۶۔ دار الاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان دار الحرب میں قید تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا یا مسلمان مستامن نے کسی مسلمان اسیر کو قتل کر دیا۔ اس قاتل پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا۔ علامہ ابن ہمام نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ اور بھی زیادہ معنی خیز ہے۔ فرماتے ہیں:۔

فلا شئ علی القاتل من احکام الدنیا الا الکفارۃ فی الخطأ عند ابی حنیفۃ وانما علیہ عقاب الاخرۃ فی العمد.... لانہٗ صار بالاسر تبعًا لھم..... وصار کالمسلم الذی لم یھاجر الینا فی سقوط عصمتہ الدنیویہ (فتح القدیر ج ۴ ص ۳۴۵)

ابو حنیفہ کے نزدیک قاتل پر احکام دنیا میں سے کچھ نہیں بجز اس کے کہ وہ خطا کی صورت میں کفارہ ادا کردے رہا قتل عمد (تو اس پر کفارہ بھی نہیں) البتہ آخرت کا عذاب ہے ..... قصاص اور دیت کے ساقط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قید ہونے کی وجہ سے وہ اہل حرب کا تابع ہوگیا ..... اور اس کی حیثیت اس مسلمان کی سی ہوگئی جس نے ہماری طرف ہجرت نہ کی ہو، اور اس حیثیت سے اس کی دنیوی عصمت ساقط ہوگئی۔

دیکھیے یہاں دستوری اور اعتقادی قانون کا فرق کس قدر نمایاں ہے۔ اعتقادی قانون مسلمانوں کو ایک قوم اور کفار کو دوسری قوم قرار دیتا ہے اور اس کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی جان مال اور عزت کو کافر کی جان و مال اور عزت پر ترجیح دی جائے۔ لیکن دستوری قانون اس عالمگیر تقسیم کے بجائے اپنے حدود عمل (جورسڈکشن) کو حدود ارضی (Territorial limits) میں محدود کرتا ہے۔ سلطنت اسلامیہ کے حدود میں جو جان ہے، جو مال ہے، جو شئے ہے وہ معصوم (Protected) ہے خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی، کیونکہ سلطنت کا قانون اس کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے۔ اور ان حدود کے باہر جو چیز ہے "غیر معصوم" (Unprotected) ہے خواہ وہ مسلم کی ہو یا کافر کی۔ اسلامی اسلامی حدود کے اندر کوئی چوری کرے گا تو ہم ہاتھ کاٹیں گے، قتل کرے گا تو ہم قصاص یا دیت وصول کریں گے، ناجائز ذرائع سے مال لے گا تو واپس

دلائیں گے۔ اور ان حدود کے باہر کوئی مسلمان یا ذمی ایسا فعل کرے جو ہمارے قانون کی رو سے جرم ہو تو ہم نہ علاقۂ غیر میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتے ہیں، نہ اپنے علاقہ میں واپس آنے کے بعد اس لئے کہ فعل ان حدود میں ہوا ہے جہاں قیام امن اور حفاظت جان و مال کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے دنیوی حیثیت سے ہے۔ حدود اسلامی سے باہر جو گناہ کیا جائے گا وہ دنیوی حکومت کے جورسڈکشن سے باہر ہونے کے باعث صرف دنیوی مواخذہ سے چھوٹ جائے گا۔ البتہ اللہ کے مواخذہ سے نہ چھوٹے گا کیونکہ اللہ کا جورسڈکشن حدود ارضی سے ناآشنا (Ultraterritorial) ہے، اس نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔

یہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قانون نہیں ہے بلکہ قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے۔ وہی قرآن جو فَاِنْ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ اور وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا کہتا ہے وہی حدود اسلامی کے اندر رہنے والے مسلمان اور علاقۂ غیر میں رہنے والے مسلمان کے خون میں فرق کرتا ہے۔ اول الذکر کو نادانستہ قتل کرنے والے پر کفارہ بھی ہے اور دیت بھی۔ اور موخر الذکر کے قاتل پر صرف کفارہ ہے[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ بن زید کو ایک سریہ کا افسر بنا کر حرقات کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہاں ایک شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ کر جان بچانا چاہتا ہے۔ اگر مسلمان اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ حضور کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو اسامہ کو بلا کر بار بار فرماتے ہیں من لک بلا الٰہ الا اللہ یوم القیٰمۃ "قیامت کے روز تمہیے لا الٰہ الا اللہ کے مقابلہ میں کون بچائے گا" مگر اس مقتول کی دیت ادا کرنے کا حکم نہیں دیتے[2]۔ ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر حدود اسلامی سے باہر رہنے والے چند مسلمان مارے جاتے ہیں

[1] وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق۔ سے یہ مراد ہے کہ اگر علاقہ غیر میں رہنے والا مسلمان کسی ایسی قوم سے ہو جس سے خون بہا کے باب میں مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہے تو جس طرح اس قوم کے ایک غیر مسلم فرد کا خونبہا دیا جائے گا۔ اسی طرح اس کے ایک مسلمان فرد کا بھی دیا جائے گا۔ پس یہ خونبہا معاہدہ کی بنا پر ہے نہ کہ عصمت اسلامی کی بنا پر۔ (ملاحظہ ہو سورۂ نساء رکوع ۱۳)

[2] ابوداؤد باب علی ما یقاتل المشرکین۔

توحضور فرماتے ہیں انا بری من کل مسلم یقیم بین اظھر المشرکین "میں ہر ایسے مسلمان کی حفاظت سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو[1]"۔ خود قرآن میں بھی ایسے مسلمان کی ذمہ داری سے برارت کا اظہار کیا گیا ہے۔

والذین امنوا ولم یھاجروا ما لکم من ولایتھم من شیئ حتی یھاجروا (۸ : ۱۰)

اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام میں) نہ آئے ان کی ولایت (حمایت وحفاظت) میں سے کوئی چیز تمہارے لیے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔

اس طرح قرآن اور حدیث نے خود ہی دنیوی عصمت کو دینی عصمت سے الگ کر دیا ہے اور دونوں کے حدود بتا دیے ہیں۔ تمام فقہائے اسلام میں صرف امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ہی ایسے فقیہ ہیں جنہوں نے اس نازک اور پیچیدہ قانونی مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے۔ امام ابویوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر مجتہدین بھی ان دونوں قسم کی عصمتوں میں پوری پوری تمیز نہیں کر سکے۔ چنانچہ مثال کے طور پر اگر دار الکفر میں اسلامی رعایا کا ایک فرد دوسرے فرد کو قتل کر دے تو یہ سب حضرات بالاتفاق فرماتے ہیں کہ قاتل سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جو "معصوم بالاسلام" تھا[2]۔ پس جب اتنے بڑے بڑے ائمہ اس مسئلہ میں مختلط ہو گئے ہیں تو کچھ بعید نہیں کہ فقہ حنفی کے متاخر شارحین کو بھی امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے کلام کو سمجھنے میں یہی خلط پیش آیا ہو۔ امام صاحب کے متعلق ہم کو تحقیق ہے کہ اوپر جتنے مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں اور اسی قبیل کے دوسرے مسائل میں انہوں نے دار الحرب کے بجائے "دار الکفر" کی اصطلاح استعمال کی تھی، کیونکہ دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دار الاسلام کا مقابل دار الکفر یعنی علاقۂ غیر یا Foreign territory ہی ہو سکتا ہے جو

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب مذکور۔ اس دوسرے واقعہ میں حضور نے مقتولوں کی نصف دیت دلوائی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ آپ کا یہ فعل اس آیت کے نزول سے پہلے کا ہوگا جس میں ایسے مقتول کی دیت ساقط کی گئی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو الجامع الصغیر، اور فتاویٰ قاضی خان۔

اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں، جو ممالک اسلامی سلطنت سے مسالمت رکھتے ہوں وہ بھی دار الکفر ہیں اور ان سے بھی وہ سب احکام متعلق ہیں جو اوپر بیان ہوئے لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دار الکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے، وہ عموماً دار الحرب ہی رہتے تھے اس لیے بعد کے فقہار نے دار الکفر کو بالکل دار الحرب کا ہم معنی سمجھ لیا اور ان دونوں اصطلاحوں کے باریک قانونی فرق کو نظر انداز کر گئے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے کلام میں ہم کو کسی جگہ کوئی ایسا لفظ نہیں ملا جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ وہ "غیر معصوم" کو "مباح" کے معنی میں لیتے تھے وہ حدود دار الاسلام سے باہر کی اشیار کو صرف "غیر معصوم" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور ایسی اشیا پر دست درازی کرنے والے کے لیے صرف اتنا کہتے ہیں کہ لاشئ علیہ - یا لم یقص علیہ وغیرہ یعنی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں، یا اس کے خلاف کوئی عدالتی فیصلہ صادر نہ کیا جائے گا۔ لیکن بعد کے فقہار نے اکثر مقامات پر "عدم عصمت" اور "اباحت" کو خلط ملط کر دیا جس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ حدود اسلامی سے باہر جتنے ممنوع افعال کیئے جائیں ان پر جس طرح حکومت اسلامی باز پرس نہیں کرے گی اسی طرح خدا بھی باز پرس نہ کرے گا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ آپ ہندوستان میں کسی کا مال چرا لیجیے۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کی عدالت میں آپ پر مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔ دار الاسلام کے قانون کی رو سے آپ بری الذمہ ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ کب ہیں کہ خدا کی عدالت سے بھی آپ چھوٹ گئے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتب فقہ میں دار الحرب کے اندر سود اور قمار اور دوسرے عقود فاسدہ کی اباحت کا جو مسئلہ اس بنا پر لکھا گیا ہے کہ حربی کے لیے کوئی "عصمت" (Protection) نہیں تو اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ دار الحرب سے مراد محض "علاقہ غیر" ہو۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ دستوری قانون سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ "حربی" (بمعنی رعیت غیر Foreigner) کے مال کی حفاظت کا ذمہ چونکہ ہم نے نہیں لیا ہے اس لیے ہمارے جورسڈکشن سے باہر ہماری سلطنت کا کوئی شہری (Citizen) اگر اس سے سود لے کر یا جوا کھیل کر یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لے کر ہمارے

علاقہ میں آجائے تو ہم اس پر کوئی مقدمہ قائم نہ کریں گے، اور اس مال پر اس شخص کی ملکیت کو جائز تسلیم کریں گے، قطع نظر اس کے کہ دین و اعتقاد کے نقطۂ نظر سے وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دارالحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل جنگ برپا ہو (یعنی Enemy Country) تو اس لحاظ سے یہ مسئلہ تعلقات خارجیہ کے قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ (باقی)

مراۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دارالترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشاء جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کرسکتا ہے۔

کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت سکہ انگریزی للعہ کھتانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

سلیم کے نام ......

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

سلیم! میرا مضمون[1] پڑھکر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں، اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے' اور جس کی نگاہ ان حقائق پر ہوتی ہے جو خدائے عزیز و حکیم نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کرکے دکھائے ہیں اور جو قوموں کی ہلاکت اور نجاح و فلاح کے لیے غیر متبدل اور اٹل قانون ہیں۔ تم میرا مسلک جانتے ہو۔ میں قرآن حکیم کو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں تمام نوع انسانی کی تمام مشکلات کا حل اور تمام مصائب کا علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ اعتقاد محض خوش عقیدگی پر ہی مبنی نہیں۔ بلکہ میں علی وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں اور ایسا یقین جو طمانیت قلب کا باعث ہوا کرتا ہے۔

تم پوچھتے ہو کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے تو ان نمازوں کا وہ نتیجہ کیوں مترتب نہیں ہوتا جو عہد صحابہ میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفہ اور درسی اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں ہو۔ اور تم جانتے ہو کہ میں بھی اسے عملی مسائل حیات کے لیے بیکار سمجھتا ہوں اس لیے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہماری نمازیں کیوں بے ثمر ہو رہی ہیں۔ سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے سخت سردی کا دن، شام کے قریب جب کہ آفتاب کی شعاعوں میں ...... تمازت باقی نہیں رہی رحمت کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آ بیٹھی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو۔ تم کھیلنے چلے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی اور شادابی ہوتی لیکن مسلسل فاقوں نے اسے

[1] "مسلمان کی زندگی" مطبوعہ "طلوع اسلام" بابت اگست ۳۶ء (نام اور مقام فرضی ہیں)

ایسا افسردگی اور پژمردگی سے بدل دیا تھا کہ وہ اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نور عصمت کے جو ہر ایسی پاکدامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہیے، رونق اور زندگی کا اور کوئی اثر باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولھے کے قریب آبیٹھی۔ خشک ٹہنیاں۔ سوکھے ہوئے پتے دوپہر کو اکھٹے کر لائی تھی انہیں سلگا دیا کہ بچے تاپتے رہیں لیکن سردی سے زیادہ تو بچوں کو بھوک ستا رہی تھی ان کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا اور یوں اُن معصوم بچوں کو ــــ نہیں! خود اپنے دل کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف دیکھتے تھے۔ جھٹپٹا ہو گیا کہ گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا ننگے پاؤں پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئیں گھٹنوں تک کا تہمد۔ پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا کہ جس کی آستین کہنیوں تک چڑھا رکھی تھی بس اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات۔ چہرہ پر زردی چھائی ہوئی۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی گھر کی طرف قدم اٹھاتا لیکن قدم مشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا۔ غریب بیوی نے منہ میں بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ بچے اٹھ کر ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے چہرے پر ڈالی اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر لوگوں کی منتیں کرتا رہا لیکن کچھ کام نہیں مل سکا!!

عین اسی وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارک اور خواجہ صاحب کو دعائیں دے رہے تھے۔

سلیم! تم عنایت اللہ کو تو جانتے ہونا جو تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کتنا ذہین اور شریف بچہ تھا لیکن بچپن ہی میں یتیم ہو گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کرتی لیکن مزدوری جب مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کے لئے مزدوری کہاں سے آئے۔ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ

صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے لیکن دل کڑا کرکے اس کو تسلی دی کہ بیٹا مدرسے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں دن میں ضرور پکا رکھوں گی۔ جاؤ میرا بیٹا! اللہ حافظ۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے چپکے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر میں نہ تھی۔ اندر آکر سب سے پہلے روٹی والے دسترخوان کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گذر رہا تھا کہ سامنے "خان صاحب" کے مردانہ مکان میں سیکڑوں آدمیوں کا مجمع دیکھا۔ متنوع پھلوں اور مٹھائیوں کے خوان سامنے رکھے تھے کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی اعطا کی تقریب تھی۔ یہ غریب دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

اور سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے لیکن تم نے شاید اس کے بیٹے کو نہیں دیکھا اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چاڑی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور لگا لیا اور کسی کو دوسرے دن خبر تک نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہوگیا۔ اس بچہ کو بیوہ نے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جن دنوں بڑے زور کا انفلوئنزا ہوا ہے وہ بھی بیمار ہوگیا محلے میں ایک حکیم جی تھے وہ بچارے نسخے مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ وہاں سے غریب بڑھیا نسخہ لکھوا لائی۔ لیکن اٹھنی پاس نہ تھی کہ دوا خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے آٹھ آنے کے پیسے قرض مل جائیں لیکن کسی نے نہ دیئے۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اور یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن "میر اشرف میموریل ہسپتال" کا سنگ بنیاد جناب کمشنر صاحب بہادر نے رکھا تھا۔

سلیم! اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ نام اور مقام بدل کر ایسے ہی اور کتنے واقعات ہر روز تمہاری نظر کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا کہ ان کی نمازیں اور روزے، ان کی زکوٰۃ اور خیرات، وہ نتائج کیوں نہیں برآمد کرتیں جو ان کا فطری

نتیجہ ہونا چاہیئے تھا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ عبادت کا مفہوم خدا اور بندے کے درمیان براہ راست ایک تعلق پیدا کردینا ہے۔ عابد اور معبود کا بلاواسطہ رشتہ جوڑ دینا ہے لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ جس سوسائٹی کے افراد کا خدا کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا ہوچکا ہو وہاں خدا کے غریب بندوں کا یہی حشر ہوگا جو تم دیکھ رہے ہو!! نماز اور روزہ صدقہ اور خیرات جس انداز و نوعیت سے اسلام نے متعین کیے ہیں یہ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرنے کا نہ صرف بہترین بلکہ میرے نزدیک واحد ذریعہ ہیں۔ لیکن اعمال کے نتائج تو مقصد اور نیت کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ جب مقصود بالذات محض ظواہر پرستی رہ جائے تو ان اعمال کے نتائج وہ کیسے ہوں جو ان کی روح کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم غور سے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ باقی ادیان جن میں انسانی تصرفات ہوچکے ہیں دین کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں جس کا مقصد ایک فرد واحد کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور بس لیکن اسلام تزکیۂ نفس اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ان مزکیٰ نفوس کے اجتماع سے جو تمثیلی (آیڈیل) انسانیت مرتب ہوگی وہ دنیا میں ایک ایسی زندگی کا وجود قائم کرے گی جو مسجود ملائک آدم کی تخلیق کا منشا تھی۔ نہ ایسی زندگی جو اس کے جوہر یُفْسِدُ فِي الْأَرْضِ وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (فساد انگیزی اور خون ریزی) کا مظہر ہوگی۔ اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ محکم اور درست ہے (اَصْلُهَا ثَابِتٌ) تو اس کا فطری نتیجہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا بھی کیوں نہ ہو۔ یہ مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ اسی عملی رہبانیت کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کے عقائد اور اعمال میں سرایت کرچکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائیگی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت فلاکت و نکبت کا چھا جانا

اور پھر اس قوم کا اس حالت میں مطمئن ہو جانا خدا کا غضب ہے۔ اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان اور عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت تمکن و استخلاف نہیں یا کم از کم وہ اس نتیجہ کی طرف رفتہ رفتہ لیے نہیں جا رہے، وہ ایمان، ایمان، اور وہ عمل، عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجہ کی طرف پہنچ ہی نہیں سکتے کہ اللہ کے وعدے تو بہرکیف سچے ہیں۔ اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کی معراج کبریٰ یعنی عہد رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ کونسا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور لیگوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا! یہی نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ ہی تو تھا کہ جس نے چند سال کے عرصہ میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی اخلاقی اور معاشرتی حالت میں ہی انقلاب پیدا کر دیا بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی۔ کھجوریں اور ان کی گٹھلیوں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والے عرب قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے وارث بنا دیئے گئے۔ انہی سیدھے سادھے اعمال نے ان کے اندر وہ خشیت الٰہی اور تقویٰ پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مرد مومن کہ جس کی شان میں خود فاطر ارض و سما نے فرما دیا کہ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيعًا۔ سلیم کیا ایسا مرد مومن دنیا میں ذلت و خواری نکبت و پستی۔ عاجزی اور مظلومی۔ بے کسی و بے بسی۔ درماندگی اور افسردگی۔ محتاجی اور گداگری کی زندگی کے لئے پیدا ہوتا ہے؟ کیا ہر باطل قوت کے سامنے جھک جانے والے نمازی۔ اور روٹی کی خاطر غیرت و حمیت بیچ دینے والے روزہ دار اسی خشیت اور تقویٰ کی پیداوار ہو سکتے ہیں! حاشا وکلا۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تمہارے جیسا پڑھا لکھا آدمی اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تو تم متفق ہو گئے کہ اسلام کا مقصد وحید انسانوں کو

دنیا میں تمام انسانی سلاسل و اغلال سے آزاد کرکے ان کو صرف اللہ کی حکومت کے ماتحت رکھنا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا مسلمانوں کی تاریخ کے ورق پلٹو اور دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت ہے کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں قائم ہوا۔ اور جو طوق یکسر غیر اسلامی تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا ہی کم وزن رکھتا تھا کہ یوں ہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ کو جن جرائم کی پاداش میں عذاب الٰہی میں گرفتار کیا گیا تھا کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے؟ پہلوں نے بھی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا، جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی سختی سے عذاب آنا چاہیے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لیے موجود تھا لیکن انہوں نے اس کو پس پشت ڈال کر (نَبَذُوا كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ) اپنے خیالات اور خواہشات ہی کو معبود بنا لیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ کم ہونی چاہیے تھی! ان کو وراثت کتاب کے لیے منتخب کیا۔ ان کو تمام نوع انسانی کی بہترین امت بنایا لیکن سب ایمان و عمل صالح کے بدلے میں۔ نہ کہ صرف نام رکھانے کے عوض! اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا غضب کیوں نازل ہوا!

سلیم! اخوت، مساوات، خشیت، وحدت انسانی۔ خدا اور بندہ کا براہ راست تعلق، یہ تھا اسلام کا مشن جو ان اعمال و عبادات کی راہوں سے ان کی سوسائٹی میں پیدا کرنا تھا۔ تم دیکھتے ہو مسلمان اس الٰہی نشان کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑو ابتدائی عہد کے اس مختصر سے دور سعادت کو! اور پھر اس کے بعد قرآن کریم کی خوردبین پر رکھتے جاؤ امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے آ جائے گی لیکن یاد رہے ابھی عزیزم۔ یہ عذاب پھر بھی ادنیٰ عذاب ہے اور اس عذاب اکبر سے ورے جو بعد میں آنے والا ہے گرفت اس لیے ہوئی ہے کہ لوگ عبرت حاصل کریں اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جنہیں دیکھنے کے تم اور ہر دردِ اسلام متمنی ہیں (وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ)۔ اور اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تم کو قرآن سے ملے گی بشرطیکہ تم اسے انسانی تحریروں سے بلند و برتر خدائے حی و قیوم کا ایک مکمل ضابطہ سمجھو۔ والسلام

پرویز

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق و مہر

(۱۰)

خاتمۂ کلام گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے اس پردہ کی پوری حقیقت واضح کر دی گئی ہے جس پر سالہا سال سے اس قدر قیل وقال کا سلسلہ جاری ہے جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا تھا نفس حجاب کا مسئلہ کچھ ایسا پیچیدہ نہیں جس کے بیان میں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہو۔ اس کی تفصیلات زیادہ سے زیادہ دس پانچ صفحوں میں بیان کی جا سکتی ہیں لیکن ہم کو جس وجہ سے اس مسئلہ پر اتنی طویل بحث کرنی پڑی وہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں چند ایسے موانع پیدا ہو گئے ہیں جن کے باعث بہت سے اسلامی مسائل کی طرح اس مسئلہ کو بھی ٹھیک ٹھیک سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا ہے، اور ان موانع کو دور کیے بغیر محض نفس مسئلہ کی تفہیم پر وقت اور محنت صرف کرنا دراصل وقت اور محنت کی اضاعت ہے۔

ان موانع میں سب سے اہم مانع یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ عموماً "یرقان ابیض" میں مبتلا ہو گیا ہے میں اپنی اس صاف گوئی پر اپنے دوستوں اور بھائیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ مگر جو حقیقت ہے اس کے اظہار میں کوئی مروت مانع نہ ہونی چاہیے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو ثابت شدہ علمی حقائق کے خلاف ہو، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو کچھ علمی حقیقت ہے وہی عین اسلام ہے۔ مگر اس کو دیکھنے کے لیے بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے وسیع نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ کھلے دل اور سلیم فطرت کی ضرورت ہے تاکہ حقائق

جیسے کچھ بھی ہوں ان کو ویسا ہی تسلیم کرے اور اپنے رجحانات کے تابع بنانے کے بجائے رجحانات نفس کو ان کے تابع کر دے۔ جہاں یہ چیز نہ ہو وہاں اگر علم ہو بھی تو بیکار رہے۔ رنگین نگاہ جو کچھ دیکھے گی اسی رنگ میں دیکھے گی جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ محدود نظر مسائل اور معاملات کے صرف انہی گوشوں تک جا سکے گی جو اس زاویہ کے سامنے واقع ہوں جس سے وہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر ان سب کے باوجود جو کچھ علمی حقائق اپنی اصلی حالت میں اندر تک پہنچ جائیں گے ان پر بھی دل کی تنگی اور فطرت کی کجی اپنا عمل کریگی وہ حقائق سے مطالبہ کریگی کہ اس کے داعیات نفس اور اس کے جذبات و رجحانات کے موافق ڈھل جائیں اور اگر وہ نہ ڈھلیں گے تو وہ ان کو حقائق جاننے کے باوجود نظر انداز کر دیگی اور اپنی ہوا کا اتباع کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس مرض میں جب انسان گرفتار ہو۔ تو علم، تجربہ، مشاہدہ، کوئی چیز بھی اس کی رہنمائی نہیں کر سکتی، اور ایسے مریض کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ وہ اسلام کے کسی حکم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، کیونکہ اسلام دین فطرت بلکہ عین فطرت ہے۔ دنیائے مغرب کے لیے اسلام کو سمجھنا اسی لیے مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے اس کے پاس جتنا بھی "علم" ہے وہ سب کا سب "اسلام" ہے۔ مگر خود اس کی اپنی نگاہ رنگین ہے۔ پھر یہی رنگ "یرقان ابیض" بن کر ہمارے عام تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں پر چھا گیا ہے، اور یہ بیماری ان کو بھی حقائق علمیہ سے صحیح نتائج نکالنے اور مسائل حیات کو فطری نگاہ سے دیکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ وہ ایمان رکھتے ہیں۔ اسلام کی صداقت کے معترف ہیں۔ اتباع دین کے جذبہ سے بھی خالی نہیں۔ مگر اپنی آنکھوں کے یرقان کو کیا کریں کہ جو کچھ ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کا رنگ ہی انہیں صبغۃ اللہ کے خلاف نظر آتا ہے لہذا صبغۃ اللہ کو ان کے سامنے پیش کرنے سے پہلے ناگزیر ہے کہ آنکھوں کی اس بیماری کا علاج کر دیا جائے۔

دوسری وجہ جو فہم صحیح میں مانع ہوتی ہے، یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ تو وہ اُس نظام اور سسٹم پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ وہ نظام سے الگ کر کے اُس خاص جزء کو من حیث ہو ہو لے لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جزء تمام حکمتوں

سے خالی نظر آنے لگتا ہے، اور اس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ سود کے مسئلہ میں یہی ہوا کہ اس کو اسلام (یعنے فطرت) کے اصول معیشت اور نظام معاشی سے الگ کر کے دیکھا گیا۔ ہزاروں نقص اس میں نظر آنے لگے، یہاں تک کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگوں کو بھی مقاصد شریعت کے خلاف اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غلامی اور تعدد ازواج اور حقوق الزوجین اور ایسے ہی بہت سے مسائل میں اسی بنیاری غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے، اور پردہ کا مسئلہ بھی اسی کا شکار ہوا ہے۔ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔ آپ کو اس کی اقامت تمام حکمتوں سے خالی نظر آئے گی۔ آپ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ انجنیر نے ایک عمارت کو سنبھالنے کے لیے کس تناسب اور کس موزونیت کے ساتھ اس کو لگایا ہے اور اس کو گرا دینے سے پوری عمارت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ بالکل ایسی ہی مثال پردے کی ہے جب وہ اس نظام معاشرت سے الگ کر لیا جائیگا جس میں وہ عمارت کے ستون کی طرح ایک ضرورت اور مناسبت کو ملحوظ رکھکر نصب کیا گیا ہے تو وہ تمام حکمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائینگی جو اس میں پوشیدہ ہیں، اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکے گی کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان یہ امتیازی حدود آخر کیوں قائم کئے گئے ہیں۔ پس ستون کی حکمتوں کو واضح کرنے کے لئے یہی ناگزیر تھا کہ وہ پوری عمارت پیش کیجائے جس میں وہ نصب کیا گیا ہے۔

اب اسلام کا حقیقی پردہ آپ کے سامنے ہے، وہ نظام معاشرت بھی آپ کے سامنے ہے جس کی حفاظت کے لیے قانون حجاب کو بطور ایک حکیمانہ تدبیر کے اختیار کیا گیا ہے، اس نظام کے وہ تمام ارکان بھی آپ کے سامنے ہیں جن کے ساتھ ایک خاص توازن کو ملحوظ رکھ کر پردے کا رکن مربوط کیا گیا ہے وہ تمام ثابت شدہ حقائق بھی آپ کے سامنے ہیں جن پر اس پورے نظام معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے اور جن میں سے ایک کو بھی مزعوم و مظنون کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی۔ ان سب کو دیکھ لینے کے بعد فرمائیے کہ اس میں کہاں آپ کوئی کمزوری پاتے ہیں؟ کس جگہ بے اعتدالی کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ کونسا مقام ایسا ہے جہاں کسی خاص گروہ کے رجحان سے قطع نظر محض علمی و عقلی بنیادوں پر کوئی

اصلاح تجویز کی جاسکتی ہے؟ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ زمین اور آسمان جس عدل پر قائم ہیں، اور کائنات کے نظم میں جو کمال درجہ کا تسویہ پایا جاتا ہے، اور نظام شمسی میں جیسا مکمل توازن و تناسب آپ دیکھتے ہیں ویسا ہی عدل اور تسویہ اور توازن و تناسب اس نظام معاشرت میں بھی موجود ہے۔ افراط اور تفریط اور یک رُخی جو انسانی کاموں کی ناگزیر کمزوری ہے، اس سے یہ نظام یکسر خالی ہے! اس میں کوئی اصلاح تجویز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اپنی عقل خام کی مداخلت سے اگر اس میں کوئی ادنیٰ ردو بدل بھی کریگا تو اس کے توازن کو بگاڑ دیگا۔

احوال زمانہ کا اقتضا: بعض حضرات ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے قوانین میں حالات زمانہ کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی تو کافی گنجائش ہے جس کا اعتراف تم نے خود بارہا کیا ہے۔ بس ہماری خواہش صرف اس قدر ہے کہ اسی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردہ میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں ایسی تربیت حاصل کریں جس سے وہ ملک کے تمدنی معاشرتی معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہوسکیں۔ اس کے بغیر مسلمان زندگی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہے جاتے ہیں، اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ اور زیادہ نقصان اٹھائیں گے، کیونکہ ملک کی سیاسی زندگی میں عورتوں کو جو حقوق دیے جارہے ہیں، اگر ان سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت مسلمان عورتوں میں پیدا نہ ہوئی، اور پردے کی قیود کے سبب سے وہ فائدہ نہ اٹھاسکیں تو ملک کے سیاسی ترازو میں مسلمانوں کا وزن بہت کم ہوجائے گا۔ دنیائے اسلام کی ترقی یافتہ اقوام مثلاً ترکی اور ایران نے زمانے کے حالات کو دیکھ کر اسلامی حجاب میں بہت کچھ تخفیف کردی ہے۔ اور اس سے چند ہی سال کے اندر نمایاں فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اگر ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے۔

یہ جتنے خطرات بیان کیے جاتے ہیں ان کے صحیح ہونے سے ہمیں انکار نہیں، مگر ان کا جو حل تجویز کیا گیا ہے اس کی صحت سے ہمیں قطعی انکار ہے۔ اس میں خیر اندیشی ہو تو ہو مگر دور اندیشی ہرگز نہیں۔ بلکہ صحیح تفکر سے بھی اس میں کام نہیں لیا گیا۔ اس خیال کو پیش کرنے والے حضرات نے احوال زمانہ کا صرف ایک رخ دیکھا ہے۔ دوسرے رخ کی طرف سے دانستہ یا نادانستہ آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اسلامی احکام میں تخفیف کی جو گنجائش ہے اس کا بھی محض ایک خیالی نقشہ ان کے ذہن میں ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ تخفیف کے اصول کیا ہیں، اور اس میں کن کن امور کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

پچھلے اوراق میں ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اسلامی نظم معاشرت کی حفاظت کے لیے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک اصلاح اخلاق۔ دوسرے تعزیری قوانین۔ تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے۔ اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔ آئیے اب اپنے ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے کہ ان تینوں ستونوں کا آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

پہلے اپنے اخلاقی ماحول کو لیجیے۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں جس کی پچھتر فی صدی آبادی غیر مسلم ہے جس پر ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے، جس پر ایک غیر مسلم تہذیب آندھی اور طوفان کی طرح چھائی چلی جا رہی ہے، پلیگ اور ہیضہ کے جراثیم کی طرح غیر اسلامی اخلاق کے اصول اور غیر اسلامی تہذیب کے تخیلات تمام فضا میں پھیل گئے ہیں۔ آب و ہوا ان سے مسموم ہو چکی ہے۔ اس کی سمیت نے ہر طرف سے آپ کا احاطہ کر لیا ہے فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے بھی چند سال پہلے تک آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ اب اس قدر معتاد ہو چکی ہیں کہ اب انہیں روزمرہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچے تک اخباروں اور رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں دیکھ رہے ہیں اور ان سے نہیں بچائے جا سکتے۔ آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچے سب کے سب سینما دیکھ رہے ہیں۔ جہاں عریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے

زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، مائیں اور بیٹیاں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر علانیہ بوس و کنار اور اختلاط و ملاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت گھر گھر اور دوکان دوکان بج رہے ہیں اور کسی کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں۔ ہندی اور فرنگی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین نیم عریاں لباسوں کے ساتھ پھر رہی ہیں اور نگاہیں ان لباسوں کی اس قدر خوگر ہو چکی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی بے حیائی محسوس نہیں کرتا۔ اخلاق کے جو تصورات مغربی تعلیم و تہذیب کے ساتھ پھیل رہے ہیں ان کی بدولت نکاح کو ایک فرسودہ رسم، زنا کو ایک تفریح، مرد و زن کے اختلاط کو ایک ناقابل اعتراض بلکہ مستحسن چیز، طلاق کو ایک کھیل، ازدواجی فرائض کو ایک ناقابل برداشت بندھن، توالد و تناسل کو ایک حماقت، شوہر کی اطاعت کو ایک نوع کی غلامی، بیوی بننے کو ایک مصیبت اور معشوق بننے کو ایک خیالی جنت سمجھا جا رہا ہے۔

پھر دیکھیے کہ اس ماحول کے اثرات آپ کی قوم پر کیا پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں اب غض بصر کا کہیں وجود ہے؟ کیا لاکھوں میں ایک آدمی بھی کہیں ایسا پایا جاتا ہے جو اجنبی عورتوں کے حسن سے آنکھیں سینکنے میں باک کرتا ہو؟ کیا علانیہ آنکھ اور زبان کی زنا نہیں کی جا رہی ہے؟ کیا آپ کی عورتیں بھی تبرج جاہلیہ اور اظہار زینت اور نمائش حسن سے پرہیز کر رہی ہیں؟ کیا آپ کے گھروں میں ٹھیک وہی لباس نہیں پہنے جا رہے ہیں جن کے متعلق آنحضرت نے فرمایا تھا کہ نساءٌ کاسیات عاریات ممیلات مائلات؟ کیا آپ اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کو وہ لباس پہنے نہیں دیکھتے ہیں جن کو مسلمان عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں پہن سکتی؟ کیا آپ کی سوسائٹی میں فحش قصے اور عشق و محبت کے گندے واقعات بے تکلفی کے ساتھ کہے اور سنے نہیں جاتے؟ کیا آپ کی محفلوں میں لوگ خود اپنی بدکاری کے حالات بیان کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس کرتے ہیں؟ جب حال یہ ہے تو فرمائیے کہ طہارت اخلاق کا وہ پہلا اور سب سے زیادہ مستحکم ستون کہاں باقی رہا جس پر آپ کی

قومی معاشرت کا ایوان تعمیر کیا گیا تھا؟ قومی غیرت تو اب اس حد تک مٹ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمانوں ہی کے نہیں کفار تک کے ناجائز تصرف میں آ رہی ہیں۔ انگریزی حکومت میں نہیں، اسلامی ریاستوں تک میں اس قسم کے واقعات علی رؤس الاشہاد پیش آ رہے ہیں۔ مسلمان ان واقعات کو دیکھتے اور سنتے ہیں، مگر ان کے خون متحرک نہیں ہوتے۔ ایسے بے غیرت مسلمان بھی دیکھے گئے ہیں جن کی اپنی بہنیں کسی متقدر غیر مسلم کے تصرف میں آئیں اور انہوں نے فخریہ اس کا اظہار کیا کہ ہم فلاں بڑے کافر کے برادر نسبتی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

اب ذرا دوسرے ستون کا حال بھی دیکھیے۔ تمام ہندوستان سے اسلامی تعزیرات کا پورا قانون مٹ چکا ہے۔ زنا اور قذف کی حد نہ اسلامی ریاستوں میں جاری ہوتی ہے نہ برٹش انڈیا میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو قانون اس وقت ملک میں نافذ ہے وہ سرے سے زنا کو جرم ہی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شریف کی بہو بیٹی کو کوئی شخص بہکا کر بدکار بنانا چاہے تو آپ کے پاس کوئی قانونی ذریعہ ایسا نہیں جس سے اس بیچاری کی عصمت محفوظ رکھ سکیں۔ اگر کوئی شخص کسی بالغ عورت پر اس کی رضامندی سے ناجائز تصرف کرے تو آپ کسی قانون کے ذریعہ سے اس کو سزا نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی عورت علانیہ فحش کاری پر اتر آئے تو آپ کے پاس کوئی قوت ایسی نہیں جس سے آپ اس کو روک سکیں۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم ٹھیراتا ہے مگر جو قانون پیشہ ہیں ان سے پوچھیے کہ زنا بالجبر کا اثبات کس قدر مشکل ہے۔ منکوحہ عورت کا اغوا بھی جرم ہے۔ مگر تبدیل مذہب کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟

غور کیجیے! یہ دونوں ستون منہدم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کے نظم معاشرت کی پوری عمارت صرف ایک ستون پر قائم ہے۔ کیا آپ اس کو بھی مسمار کر دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف پردے کے وہ نقصانات ہیں جن کو آپ نے اوپر گنایا ہے۔ دوسری طرف پردہ اٹھا دینے میں پوری قومی معاشرت کی تباہی ہے۔ دونوں کے درمیان موازنہ کیجیے۔ مصیبتیں دونوں ہیں۔ اور ایک کو بہر حال قبول کرنا

ہے۔ اب آپ خود ہی اپنے دل سے فتوی طلب کیجیے کہ ان میں سے کون سی کم تر مصیبت ہے ؟

ہندو قوم کی مثال نہ لائیے۔ ان کا نظام معاشرت اس قدر سخت ہے کہ عورتوں کی ظاہری آزادی سے ابھی ایک زمانہ تک یہ نتائج رونما نہیں ہو سکتے۔ ان کے ہاں عورت کو تمام حقوق سے محروم کر کے بالکل مرد کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے۔ وہ ہندو معاشرت میں رہ کر مرد کے خلاف بغاوت کر ہی نہیں سکتی۔ مرد جب چاہے اس کی زندگی کو بالکل تباہ کر سکتا ہے۔ مسلمان عورت کا یہ حال نہیں۔ اسلام نے پردے کی قید لگانے کے بعد اس کو تمام مدنی حقوق عطا کر دیے ہیں۔ اس کے اختیارات یورپین عورت سے بھی زیادہ ہیں۔ صرف اجتماعی زندگی کی ان رکاوٹوں نے جن کو پردے سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کو بے قیدی سے بچا رکھا ہے۔ اگر ان رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے۔ اور موجودہ مغربی تمدن کی ہوا اسے لگ جائے تو اس کا قدم مغربی عورتوں سے بھی آگے ہوگا۔ وہ چند ہی سال کے اندر اسلامی نظام معاشرت کی تمام حدود کو توڑ کر رکھ دیگی۔

اسلامی ممالک کی مثال بھی آپ پیش نہیں کر سکتے۔ آپ ترکی و ایران کا نام تو لیتے ہیں، مگر آپ کے ہاں کوئی مصطفےٰ کمال اور کوئی رضا شاہ بھی ہے؟ وہاں وہ طاقت ور فولادی ہاتھ حکومت کر رہے ہیں جو ساری قوم کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے ہیں۔ وہ اگر غلط راستہ پر لے جانے کی قوت رکھتے ہیں تو اس راستہ سے پھیر لانے پر بھی ہر وقت قادر ہیں۔ ان کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہیں، سوچنے والے دماغ ہیں، عمل کرنے والے ہاتھ ہیں۔ اول تو ان کی حکومت میں عورتوں کی آزادی کے اتنے برے نتائج ظاہر ہی نہیں ہو سکتے جتنے ہندوستان میں ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر کبھی انہوں نے کسی نتیجۂ بد کو محسوس کیا تو آن واحد میں وہ اسی طرح عورتوں کو گھروں میں دھکیل دیں گے جس طرح ہٹلر اور مسولینی نے دھکیل دیا ہے، اور کسی میں ان کے حکم سے سرتابی کی قوت نہ ہوگی۔ کیا آپ کی بن سری قوم میں بھی کوئی ایسا ہے؟ کیا آپ میں اتنی قوت ہے کہ اگر قومی معاشرت اور قومی اخلاق پر کوئی تباہی کا سیلاب امڈ آیا تو اس کو روک سکیں؟ آپ تالاب کے بند کو جب چاہیں توڑ سکتے ہیں، مگر خطرے کے وقت طوفان کا منہ پھیر دینے والا تو مجھے آپ میں کوئی نظر نہیں آتا۔

پس اگر احوال زمانہ ہی پر فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستان کے احوال پردے میں تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں کیونکہ ہماری قومی معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں، اور اب تمام دار و مدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھیے، غور کیجیے، اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں۔ مگر اس بچے کھچے ستون کو جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے، اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیئے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لئے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں ان آنکھوں کو نکال لینے کے لئے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں۔

(باقی)

مطبوعات

الفرقان شہید نمبر

بریلی سے مولانا محمد منظور نعمانی تقریباً ڈھائی سال سے ایک عمدہ مذہبی رسالہ "الفرقان" کے نام سے شائع کر رہے ہیں جس کا نصب العین بدعات وخرافات کا ردّ اور عقائد صالحہ کی اشاعت ہے۔ حال میں انہوں نے اس کا ایک خاص پرچہ شہید نمبر کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ نمبر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال وسوانح اور ان کی عظیم الشان دینی خدمات کے تذکرے پر مشتمل ہے اور چونکہ حضرت شہید کی سیرت تمام تر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت سے وابستہ ہے لہٰذا ساتھ ساتھ ان کے حالات بھی آگئے ہیں۔

اسلامی ہند کے دور اخیر میں تین شخص ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اس ملک میں اسلامی اقتدار کی حفاظت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ سب سے پہلے ٹیپو سلطان، اس کے بعد سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل۔ ان تینوں شہیدوں میں سے مقدم الذکر کی خدمات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ اور موخر الذکر دونوں حضرات نے سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے وہ خدمات انجام دی ہیں جن کی نظیر بجز سلف صالح کی سیرتوں کے اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلمانانِ ہند کی شامتِ اعمال سے قہر الٰہی کی آمد مقدر ہو چکی تھی اس لئے اسلام کے یہ تینوں جاں نثار خادم اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے، مگر انہوں نے بہرحال اپنا فرض ادا کر دیا۔ بازی اگرچہ پا نہ سکے سر تو کھو سکے۔ حیف ہے کہ مسلمان اب ان کی جاں نثاریوں کی یاد بھی دل سے بھلا دیں۔

مولانا محمد منظور صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہمارے تین قومی شہیدوں میں سے دو کی یاد تازہ کی اور وہ نمونے ہمارے سامنے پیش کئے جو ان کی یاد کیساتھ ہمارے ایمان کو بھی تازہ کرنے والے ہیں۔ شہید نمبر کے تمام مضامین اس قابل ہیں کہ ان کو پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔

قیمت قسم اول ۱۰/ ۔ قسم دوم ۷/ ۔ جو حضرات الفرقان کے باقاعدہ خریدار ہونا چاہیں ان کے لئے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ تین روپے بھیج کر ماہ محرم ۵۵ھ سے خریدار بن جائیں۔ اس صورت میں ان کو شہید نمبر کی قیمت علیحدہ نہ دینی پڑیگی۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کی شہرۂ آفاق تصنیف

تمدن عرب

جو

مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء کی صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے علاوہ
نواب جیون یار جنگ بہادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے
عالمانہ، مبصرانہ، ناقدانہ، مقدمہ اور فاضل مترجم

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی

مرحوم کے جامع سوانح کے ساتھ نیز (۵) رنگین (۱۳۷) سادہ تصاویر (۳) نقشوں کے ہمراہ
جس کی قیمت پچاس روپے تھی مگر سو روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اب

اعلیحضرت فرمانروائے دکن مد ظلہ

کے جشن سیمیں کی شادمانی میں اعظم اسٹیم پریس کی جانب سے شائع ہو چکی ہے
قیمت صرف پچیس روپے سنہری جلد خرچ ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

عبد القادر

پبلیشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار
حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن